6453

سلسلہ انجمن اصلاح العشیرہ نمبر ۴

عہدِ سلف

کے نشو ونما اور دکن میں اسلامی سلطنت کے قیام پر تبصرہ

تالیف

جناب مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم

بحسن انتظام جناب حافظ حاجی محمد عبدالعظیم صاحب

باہتمام محمد شمس الدین خاں پروپرائٹر

بہ شمس المطابع مشین پریس عثمان گنج حیدرآباد دکن طبع شد

بست عمًا سکۂ عثمانیہ تعداد طبع (۱۰۰۰) ۱۳۴۰ھ

فہرستِ مضامین

دارالعلوم کی جدید اسکیم کا جب نفاذ ہوا تھا تو اس امر کی کوشش ہوئی تھی کہ مرحوم کے خدمات "شیخ التاریخ" کے عہدہ پر حاصل کئے جائیں۔ اسکی بھی نوبت نہ آسکی۔ سررشتہ تعلیمات نے مرحوم سے شاہانِ آصفیہ کے سوانح لکھوانے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ اس کا بھی موقع میسر نہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد بہت جلد مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم جیسے نامور مورخ نے "مددگاری تدوین تاریخ اسلام" پر مرحوم کا تقرر کرایا۔ اس انتخاب کو "بہترین انتخاب تسلیم کیا گیا"۔ چونکہ شرر مرحوم ایک نہایت قلیل عرصہ میں خود اپنے وطن میں رہ کر کام کرنے کے لئے متعین کر دیئے گئے لہذا اس عہدہ پر بھی اُن کو کام کرنے کا موقع نہ ملا۔

بہرحال مرحوم "تاریخ سلطنت آصفیہ" کی ترتیب اور تکمیل "بحیثیت ایک ادنیٰ جاں نثار رعیت سلطنت ابدمدت آصفیہ" اپنا "فریضہ ملکی و قومی" تصور کرتے تھے اور بائیس تیئیس سال تک جب کبھی ان کو موقع ملا اور اشغال ملازمت اور خدمت قوم سے فرصت ملی اس اہم کام کے لئے مواد فراہم کرنے میں مصروف رہے۔ صحیفہ ماہواری میں اس موضوع کے بعض ابواب پر نہایت شرح وبسط سے ان کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ ارادہ قوۃ سے فعل میں آتا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے ملک سے "روشناس ہوکر اپنے پہلے اجلاس کے حسن اختتام کے ساتھ ہی اس شہر خموشان جذبات وطن پرستی میں دفعتہً زندہ دلی کے گلزار نمایاں کردئے"۔ اس کے بعد مشاغل دفتری سے جو وقفہ ملتا تھا وہ قوم کے نذر ہو گیا۔ "حتیٰ کہ بعد برخاستِ دفتر دن کی تھوڑی سی روشنی باقی رہنے تک دفتر کانفرنس میں کام ہوتا رہتا اور پھر بھی حسرت رہ جاتی کہ کاش دن اور ذرا بڑھ گیا ہوتا"۔

اس کے باوجود ملک کو اسکی اصلی تاریخ سے مستغنی کردینے کی ضرورت ایسی نہ تھی کہ اس سے چشم پوشی کرلیجاتی کہ بقول ان کے " یہ کام تمام زندہ قوموں میں قومی زندگی کا سب سے اصلی

اور مقدم عنصر ہے اور جس کی بدولت سلطنت کی عظمت اور خاندان شاہی کے ساتھ ارادت اور عقیدت کا لازوال تاج ہر ایک نسل پیچھے آنے والی نسل کو اور زیادہ مرصع کرکے امانت پہونچاتی جاتی ہے۔"

غرض ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ میں مرحوم نے اس ضرورت کے رفع کرنے کے قصد مصمم سے رخصت حاصل کی اور اس سے پہلے کے جمع کردہ مواد کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔ ۶ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ کو انھوں نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ "آغاز نظام آصفی"۔ ۱۵ جمادی الاول ۱۳۳۶ھ کے روز تحریر کیا ہے کہ "نظام آصفی۔ خاکہ تکمیل شد از حدیقۃ العالم کہ تا ایں زماں ماخذ بود۔ اکنوں تکمیل عمارت شدنی است"۔ قبل اسکے کہ کام ختم ہوتا مجبوراً بادل ناخواستہ دفتری فرایض کی ادائی کے لیے پھر رجوع ہو جانا پڑا۔ کام ادھورا رہگیا۔ بہرنوع تا دم مرگ مرحوم کی پوری توجہ اس جانب مایل رہی اور وہ حسب امکان لکھتے اور مواد جمع کرتے رہے۔

نفس کتاب کے متعلق مرحوم کے عندیہ کی نہایت واضح صراحت اُن کی اُس یادداشت سے ہوگی جو اس عرض کے بعد درج ہے۔

بہرحال مرحوم اپنے کام میں آہستہ آہستہ تکمیل کی صورت پیدا کرتے جاتے تھے تاآنکہ اسقدر حصہ تقریباً مکمل ہوگیا کہ جو اب ابنا ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ جب یہ حصہ شایع ہونے کے قابل ہوگیا تو مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی عزالدین محمد صاحب نیز مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب اور مولوی عبدالرحیم صاحب معتمد انجمن اسلامیہ نے اسکے بطور خود طبع کی خواہش ظاہر کی لیکن افسوس ہے کہ مرحوم کی زندگی میں اسکی صورت نہ ہوسکی۔ جب رسالہ "ترقی" شایع ہونے لگا تو اس طرح اس کتاب کا ایک حصہ بھی اس میں شایع ہوا۔ پوری کتاب اس ذریعہ سے بھی شایع نہ ہوسکی۔ "ترقی" کی جگہ جب "ترجمان" نے لی تو اس کے شایع شدہ صرف ایک ہی نمبر

میں اس کتاب کا بھی ایک حصہ شایع ہوا۔ پھر "ترجمان" بھی بند ہوگیا تو لامحالہ سلسلہ طباعت کتا بھی ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی مصنف کا پیمانہ حیات بھی لبریز ہوگیا۔ چونکہ مصیبت تنہا نہیں آتی اسلئے ایک غضب یہ بھی ہوا کہ مدیر 'ترجمان' کے حوالہ جو حصہ کتاب کیا گیا تھا افسوس ہے کہ وہ تلف ہوگیا۔ چار سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ انتظار و تلاش کی ساری منزلیں طے کیجارہی ہیں لیکن اب تک ناکامی ہے۔ کتاب کا شایع ہونا ضرور تھا اس لئے چارہ سوا اس کے نظر نہیں آیا کہ جو مسودہ موجود تھا اس سے تلف کردہ مبیضہ کی تلافی کرلیجائے۔

اس موقع پر یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ کتاب کا وہ حصہ جو بیجانگر کے بیان تک مشتمل ہے مرحوم کا آخری مرتبہ صاف کیا ہوا ہے۔ اس پر انھوں نے اپنی آخری نظر ڈال لی تھی۔ یہ حصہ جہاں ختم ہوتا ہے وہاں حاشیہ لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد سے آغاز باب تک وہ حصہ ہے جس کا مبیضہ نہایت افسوس ہے کہ کھو دیا گیا۔ اسکی تکمیل جو مسودہ رہ گیا تھا اس سے کرلی گئی ہے غنیمت یہ ہوا کہ یہ حصہ مسودہ موجود رہ گیا' ورنہ مرحوم کی عادت تھی کہ مبیضہ کرلینے کے بعد مسودہ چاک کردیا کرتے۔ اس کے بعد سلطان علاءالدین بہمنی کے بیان سے عادل شاہی بیان کے آخر تک مرحوم کا نظر ثانی شدہ مبیضہ موجود ہے۔ احمد نگر کے بیان کا بڑا حصہ مبیضہ کی حالت میں موجود ہے لیکن اس کے آخری حصہ کی نظر ثانی ان سے نہ ہوسکی تھی۔ قطب شاہی بیان کی مرحوم نے نظر ثانی کے بعد تبیض کرلی تھی۔ لیکن باوجود اسکے یہ ایک واقعہ ہے کہ کتاب بحیثیت مجموعی از سر نو نظر ثانی کی محتاج تھی۔ بہرحال اس امر کی نہایت درجہ کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کے الفاظ ہی باقی رہیں۔ البتہ جہاں مسودہ قدرے صاف نہیں تھا وہاں نہایت قلیل لفظی تغیر کے بغیر گزیر نہیں تھی۔

جیسا کہ مرحوم کی یادداشت سے جو اس کے بعد درج ہے واضح ہوگا انھوں نے اپنی

کتاب کے کئی حصے قرار دے تھے:۔

(۱) اسلام کے نشوونما اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام پر ایک تبصرہ۔ اور

(۲) حضرت آصفجاہ سے پہلے کے تمام تمدنی اجزاء کا بیان۔

اس کا نام مرحوم نے "نظم قدیم" قرار دیا تھا۔

(۳) دوسری جلد میں حضرت آصف جاہ اول کی مکمل سوانح حیات' موسوم بہ "نظام آصفی"

(۴) تیسری جلد "تاریخ سلطنت آصفیہ" موسوم بہ "حیاتِ تمدن"۔

لیکن جب موجودہ حصہ کتاب مکمل ہو گیا تو مرحوم نے اس پر ہی پہلے حصہ کو ختم کر دیا اور اس کا نام "**عہدِ سلف**" قرار دیا۔ "نظمِ قدیم" تمدنی حصہ کا نام قرار دیا گیا۔ افسوس ہے کہ "نظمِ قدیم" اور "نظامِ آصفی" کا خام مسودہ خام حالت میں ہی رہ گیا۔ "حیات تمدن" کا خاکہ بھی مرتب کرنے کی انکو مہلت ہی نہیں ملی۔

مرحوم کی اس قلمی کاوش کو ان کی یادگار کے طور پر پیش کرنے کی سعی میں حافظ عبدالعظیم صاحب نے امور طباعت وغیرہ کے متعلق جو امداد دی ہے اس کا شکریہ ازبس ضروری ہے۔ بغیر ان کی امداد کے یہ کوشش بارآور نہیں ہو سکتی تھی۔ مولوی حافظ محمد مظہر صاحب نے مسودہ کو مطبع میں دینے کے قابل بنانے میں نہایت گرانقدر امداد کی ہے۔

مرحوم کے انتقال کے تقریباً چار سال سے زیادہ کے بعد توفیق ربانی اب مساعد ہوئی کہ مرحوم کی قلمی کاوشوں کو علمی دنیا کی خدمت میں پیش کرنے کی سعی آغاز کی جائے۔ مرحوم کی "علمی مشاغل کی تمنا" اب فی الواقعہ ہمیشہ کے لئے آغوش لحد میں سوگئی ہے۔ ان کی یہ آرزو آرزو ہی رہ گئی کہ ان کی مصروف اور پر از کشمکش زندگی میں وہ وقت بھی آئے کہ کسی گوشہ عافیت میں علم کی خدمت گزاری نصیب ہو۔ اللہ غالب علے امرہٖ اس کا کوئی موقع ان کو میسر نہ ہوا۔ بریں ہم قومی خدمت

گذاری کے پرخار راستہ میں منزل پر منزل طے کرکے انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں شوقِ
علم کی جو تپش پیدا کی اور حب وطن کا جو تازہ ولولہ پیدا کیا اس کے لحاظ سے کیا عجب ہے کہ
اس "نقش اول" کی وجہ سے بھی اس سنسانی کے عالم میں حیات و تازگی کے جسد میں قوت اور
جوش کی روح از سر نو بھرنے کے لئے کوئی پرزور تگاپو پھر آغاز ہو۔ اور دکن کی سرسبزی اور
شادابی کے لئے کوشش و سعی کا نیا سلسلہ لازوال طور پر شروع ہو اور سلطنت آصف جاہی کی
عظمت و مرتبت کی بقا کے لئے سب فرزندان وطن پھر راہ عمل میں گام زن ہوں اور اس
طرح ملک کی آئندہ نسلیں زیادہ باوقار اور زیادہ سربلند ہوں۔

دعا ہے کہ حیدرآباد کا نام تمام دنیا میں روشن دماغی، آزادانہ ترقی اور ہر شخص کیلئے
سرچشمہ ہدایت کا مترادف بن کر گونج اٹھے"۔ اور سلطنت آصف جاہی زیر سایہ اعلیحضرت
بندگان عالی متعالی نواب میر عثمان علی خاں مدظلہم العالی اپنے تاریخی زرین روایات
کے ساتھ اور زیادہ پائیدار اور قوی ہو۔ آمین۔ فقط

خاکسار

محمد غوث

حیدرآباد دکن
۲۱ ذیقعدۃ الحرام ۱۳۴۸ھ
دوشنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب کے متعلق مرحوم کی ایک یادداشت کا اقتباس

مدتوں سے میرا خیال تھا کہ حضرت آصف جاہ اول نور اللہ مرقدہ کی لائف مرتب کی جائے اور اسکے بعد سلطنت آصفیہ کی تاریخ۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ سرکار آصفیہ نے بھی اس طرف توجہ فرمائی۔ لیکن کوئی تاریخ اس وقت تک اس موضوع پر ایسی مرتب نہیں ہوئی ہے کہ مشرقی و مغربی تصانیف سے مبسوط اور مدلل طریقہ پر اخذ کی گئی ہو۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد یونیورسٹی کے نصاب میں تاریخ سلطنت آصفیہ کا مضمون بھی اضافہ ہو جائیگا، لیکن بحالت موجودہ بھی کم از کم تاریخ ہند کے نان ڈٹیل کورس کے طور پر تاریخ سلطنت آصفیہ بھی مرتب کرائی جانی ضرور ہے جس سے خود ہندوستان کی عام تاریخ پر بہت کچھ صحیح روشنی پڑسکتی ہے۔ اہل نظر کے پاس مسلم ہے کہ اب تک کوئی "تاریخ ہند" صحیح روشنی میں لکھی نہیں گئی ہے۔ یورپین مصنفین نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بہت سی قطعی اغلاط کا مجموعہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ کم از کم سلطنت آصفیہ کی ایک تاریخ جدید اصول تاریخ کے مطابق صحیح مواد سے مرتب کر کے لکھی جائے جس سے ایک طرف مغربی مصنفین کے غلطیوں کی اصلاح ہو تو دوسری طرف ہماری قدیم تاریخوں میں جو نقص ہے وہ دور ہو جائے۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ ایسی تاریخ ہو جس سے اصول جدیدہ تاریخ کے مطابق واقعات کے اسباب و علل کا صحیح سلسلہ اور ہر قسم کا ذخیرہ معلومات تمدنی جو آجکل ضروری

ہے اس سے دستیاب ہو۔

جب میں نے لائف لکھنی شروع کی تو مجھے ناگزیر سلسلہ بیان قایم کرنے اور صحیح نتائج حاصل کرنے کے لئے اسلام کے نشو و نما پھر ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام پر ایک تبصرہ لکھنے کی ضرورت داعی ہوئی چنانچہ اس کا خاکہ کم و بیش سو صفحہ ہے۔ اِسکے بعد تمام تمدنی اجزاء، انتظام مملکت، علمی ترقیات، اخلاقی و روحانی مشنری، ثروتی معاشرتی حالات کا مسودہ خام لکھا گیا ہے جو اندازاً سو صفحہ ہوگا۔ اس طرح یہ گویا پہلی جلد ہوگی جس کا نام "نظم قدیم" رکھا گیا ہے۔[ف] دوسری جلد میں حضرت آصف جاہ اول کی مکمل لائف ہوگی موسوم بہ "نظام آصفی"۔ تیسری جلد "تاریخ سلطنت آصفیہ" موسوم بہ "حیات تمدن"۔

بیس سال تک عمر مدرسہ میں بسر ہوئی۔ مدرسہ سے نکلتے ہی امیدواری و ملازمت کے چکر میں سرگرداں رہا حتی کہ اب چالیس سال عمر ہو چکی۔ بصارت میں ضعف محسوس ہو رہا ہے اور حالت ایسی ہے کہ اگر اسی دفتری زندگی کا سلسلہ چند دن اور جاری رہے تو شاید علمی مشاغل کی تمنا ہمیشہ کے لئے آغوش لحد میں سو جائے۔

...... میری آرزو اسی قدر ہے کہ ...... مجھے ایسی حالت میں کہ ابھی میری آنکھیں کام کر سکتی ہیں اسکے پورا کرنے کا وقت ملجائے اور بس

مرقوم ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ

ہیچ میرز مرتضیٰ

ف جیسے کہ عرض حال میں بیان کیا گیا ہے اس حصّے کو مرحوم نے پھر دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصہ عہد سلف اور دوسرا نظم قدیم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

کل میسر لما خلق لہ" روحِ ترقی" کے مبارک سراپا حقیقت خواب کا جسنے بالآخر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تعبیری صورت اختیار کی ایک جزو "نظام آصفی" بھی تھا بیداری کیلئے جس چیز کی ملک کو ضرورت ہے وہ اسکی تاریخ ہے۔ زندہ قومیں اپنی قومیت کی بقا کا انحصار اسی پر سمجھتی ہیں کہ اپنی تاریخ بچے کی گھٹی میں داخل ہو۔ قوم کا بچہ آنکھ کھول کر تاریخی سبق لے، بڑا ہوکر اپنے کاموں کی بنیاد رجال قوم کے نقش قدم پر رکھے اور مرنے کے بعد اسی سلسلہ فہرست میں اُسکا نام داخل ہو۔ تاریخ ہی تمام قوم کی زندگی کا محور ہو جس پر ملک کی عزت مبنی ہے۔

ہمارے خواب غفلت کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے نصاب میں یہ تو داخل ہے کہ انگلستان نے خومیگنا چارٹا حاصل کیا اور تاج برطانیہ کے سایہ میں ہندوستان نے دستور کی شکل دیکھی۔ لیکن ہم اس سے بیخبر ہیں کہ حضرت آصفجاہ نے رعایا، آصفیہ کو کیسا مبارک دستور مرحمت فرمایا جس کے شکرانہ میں رعایا دآصفیہ کو تا ابد رطب اللسان رہنا بجا ہے۔ یہ مبارک نام ایسا ہے کہ ہر بچے کی زبان پر عقیدت و ارادت کے ساتھ آنا چاہئے۔ اسی افسوسناک نقص کے دور کرنے

لہ۔ مرحوم کی ایک تصنیف جس میں اس سوال کا کہ "حیدرآباد کیوں ترقی نہیں کرتا" جواب دیا گیا ہے۔ ۱۲

کے لئے یہ کتاب تیار کی گئی ہے اور اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ اس مبارک ہمیرو کی طرح اسکو بھی حسن قبول عطا ہو۔ یہ کتاب آئندہ اور ایسے تصانیف کے سلسلہ کا آغاز ہے جس سے سلطنت کی عظمت اور خاندان شاہی کے ساتھ ارادت و عقیدت کا لازوال تاج ہر ایک نسل پیچھے آنیوالی نسل کو اور زیادہ مرصع کر کے امانت پہنچاتی جائے۔ آمین

حضرت آصفجاہ کی لایف لکھتے ہوئے ضرورت محسوس ہوئی کہ عہدِ اسلامی کے متعلق ایک تبصرہ قلمبند کیا جائے۔ چنانچہ یہ حصہ اول اسی ضرورت سے مرتب کیا گیا ہے۔



۶۸۶

عہدِ سلف

باب اول

فتوحات و حکومت اسلامی

غزوات نبی علیہ السلام | اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ ایسے وقت میں جبکہ فاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یا شاہدِ ہستی مطلق کا جمال جہاں آرا کسی قوم میں بھی صاف نظر نہیں آتا تھا، ایسے مقام میں جہاں ہر طرف پہاڑیوں کے جمے ہوئے قطار در قطار تودوں اور سخت زمین کے سوا کوئی سرسبزی یا دل لبھانے والی چیز نظر نہیں آتی، امین قوم، نورِ دو عالم، حسن مجسم اقرء باسم ربك الذی خلق کی مبارک تعلیم آغاز کرتا ہے اور تیرہ سال کی مسلسل کوشش کے بعد جب اس کا صلہ یہ دیکھتا ہے کہ قوم دنیا کو اسکے وجود سے خالی کرانا چاہتی ہے تو صدیوں کے آبائی وطن سے چھپے چھپے جدا ہوتا اور اسی خطے کی ایک سرزمین میں جہاں کسی قدر سرسبزی بھی ہے، ہجرت کر آتا ہے۔ اب (۶۰۰) قابلِ جنگ مردم شماری ہو جاتی ہے۔ قوم بزورِ شمشیر اس آوازِ توحید کو خاموش کرانا چاہتی ہے۔ بدر صداقت (۳۱۳) جانبازانِ راہ توحید کی ضعیف جماعت میں یہی دعا کرتا ہے" اور اللہ! اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج مار ڈالی گئی تو پھر کبھی زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی"۔ محبت حق کی سرشار یہ چھوٹی سی جماعت

اپنے سے سہ چند دولت اور رسم پرستوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ ہر طرف مخالف جماعتیں، جن میں یہ مہاجر گھرے ہوئے تھے اُن کے خلاف اُکساتے ہیں۔ دس ہزار مختلف اقوام و قبائل کا مجمع خود دارالہجرت کو گھیر لیتا ہے۔ منافق کہنے لگتے ہیں کہ "پیغمبر کہتا ہے کہ میرا دین مشرق و مغرب میں پہنچے گا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ جائے ضرور کو بھی نہیں نکل سکتے"۔ پیغمبر عرب کے فدائی مسلمان فارسی کے مشورے کے مطابق خندق کھود کر حفاظت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور بالآخر مجمع باہمی نااتفاقی سے خود ہی پریشان ہو جاتا ہے۔ اب ایک مختصر سی حکومت قایم ہو جاتی ہے، جس میں آس پاس کی زمینیں شامل ہوتی ہیں۔ قریش صلح کرتے ہیں۔ سچائی کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جاتا ہے۔ قاصد کو مار ڈالنے کی وجہ سے شاہ غسان کے مقابلہ کیلئے تین ہزار کی جمعیت شام کی سرحد پر بھیجی جاتی ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز نظارہ ہے کہ ایسی بے سروسامان جماعت ایک شاہی فوج کے سامنے صف آرا ہوتی ہے جس میں قیصری قواعد داں باقاعدہ فوج کے دستے بھی شامل ہیں اور جسکی تعداد ایک لاکھ بیان کی گئی ہے۔

بالآخر ہجرت سے آٹھ سال کے بعد قریش کی عہد شکنی کی وجہ سے امام طیبہ والحرم دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ وطن میں آتا ہے اور بقول امیر علی یہ ایک ہیئت عجیب و غریب سماں ہے کہ ایسی بڑی فوج کے ایسے آباد اور دولت مند شہر میں داخلہ کیوقت خود پیش قدمی کرنیوالے معدودے چند بارہ تیرہ یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس آدمی مارے جاتے ہیں۔ کوئی لوٹ مار مطلق نہیں ہوتی نہ کسی قسم کے احتیاطی تدابیر اختیار کئے جاتے ہیں، نہ کسی کی جان لیجاتی ہے۔ معدودے چند جو اپنے سابقہ جرایم کے لحاظ سے واجب القتل قرار دئے گئے تھے اُن میں سے بھی صرف چار اپنی کرتوت سے مارے گئے۔ قوم کا ستم اٹھایا ہوا سپہ سالار یہی حکم دیتا ہے "جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ فاتح مفتوح سب ایک ہو جاتے ہیں۔

اب ایک تیس ہزار کی بھوکی پیاسی خستہ حال فوج کے ساتھ سالارِ عرب رومیوں کی مدافعت کے لئے موسمِ گرما میں اُس سنگلاخ سرزمین کو طے کرتا ہوا ارضِ مقدس کے قریب قریب تبوک میں پہنچتا ہے جہاں ہر طرف پانی ہے۔ قدرت کے حسن کی رنگ برنگی بہار ہے۔ پہاڑ بھی ہیں تو رنگا رنگ نظر فریب سرسبزی ہے۔ بڑے بڑے آباد شہر ہیں دولت کے انبار ہیں۔ مقامی مسیحی رؤسا، اسلام کے پرامن سایہ کے نیچے شدید ہیجانکسوں اور مذہبی ظلم و تعدی کے ہاتھ سے جزیہ دیکر آسایش و راحت کے مزے لوٹنے لگتے ہیں جو اُس وقت مسیحی قیصری حکومت میں نابود ہو رہے تھے۔

امیرِ قافلہ کا آخری حج ادا ہوتا ہے جس میں ایک لاکھ سے زائد دل بادل انسان توحید کا نعرہ بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے اونٹ کا کجاوہ اور چادر ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کے نہیں۔ اُس کی زبان سے " لبیك بحجة لا سمعة فیها ولا ریاء " کی آواز بلند ہوتی ہے۔ جب اِس طرح خدا کا وعدہ سچا ہو چکا اور فتح و نصرت حاصل ہو چکی تو سالارِ عالم رفیق اعلیٰ کیساتھ ہو رہتا ہے۔

فتوحات صحابہ کرام لیکن اس کی مبارک تعلیم جاری ہے۔ وہ ضعیف و خستہ حال جو شام و مصر سے چھوٹا موٹا سامانِ تجارت اپنے خشک ملک کیلئے لاتے تھے نہ صرف اُن ممالک کے حکمراں بنجاتے ہیں بلکہ تمام آباد و متمدن دنیا دیدہ و دل اُن کیلئے فرشِ راہ بنا دیتی ہے۔ شام کا ملک جسمیں رومیوں کی سلطنت سات سو برس سے چلی آرہی تھی سات سال کے اندر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اخیر بادشاہ ساسان کو تخت سے اتار دینے اور اُسکے ملک پر جو اتنے زمانہ دراز سے شاہانِ شاہ کی مِلک چلا آتا تھا قبضہ کرلینے کیلئے دو مہینے کافی ہوئے[۵]

دس سال کے اندر کل عراق، ایران، شام اور مصر میں اسلامی عدل، مساوات، مذہبی رواداری، بہبودی و رفاہ عامہ کی عملداری تھی۔ اس تھوڑی سی مدت میں اس ضعیف جماعت کی نہ صرف ایسی

---

۵ تمدن عرب صفحہ (۱۳۰)

افسوس شہادت سے اسلام کو ایسا صدمہ پہنچا کہ اُس کا اثر ابتک زائل نہیں ہوا۔ لیکن ابھی فاروقی اصول بحال و برقرار تھے اور اُن کا اثر زندہ تھا۔ چنانچہ خلافتِ عثمانی میں کابل غزنی اور موجودہ بلوچستان مستقل اسلامی صوبے بن گئے۔ مہلب نے کابل کے راستے سے ہندوستان میں قدم رکھا۔

اویلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض کی تصدیق سامنے آتی ہے جس کے بعد بجائے نظامِ مساوات وجمہوریت شانِ حکومتِ قیصری کا انداز پیدا ہونے لگتا ہے بقول ابن عجم سنتِ ابوبکر و عمر کے عوض سنتِ کسریٰ و قیصر کی تقلید ہونے لگتی ہے۔ قصہ مختصر جب ایک زبردست سلطنت قایم ہو جاتی ہے تو اُسکے بعد زیادہ تر باغراضِ سیاست فارورڈ پالسی کا دور دورہ ہوتا ہے۔

فتح سندھ حجاج بن یوسف عربوں کے پاس اپنے سیاسی اغراض کے پورا کرنے میں کیسا ہی ظالم مشہور ہو لیکن یہی حجاج اُس وقت کی اسلامی دنیا سے باہر اسلامی تہذیب کا راہ نما بنتا ہے۔ اُس کی قرآن مجید کی خدمت مشہور ہے۔ اسلامی دور دورہ سے ذرا پیشتر جب ساسانیوں نے ایران میں آخری سنبھالا لیا تھا تو ایرانی تاجدار نے سندھ پر حملہ کر کے سندھ کے راجہ سی ہرس کو شکست دیکر مار ڈالا تھا۔ اُسکے بعد اس کا بیٹا ساہسی تخت نشین ہوا جو لاولد تھا۔ اُسکے مرنیکے بعد حکومت بجائے خاندانِ اہلِ شمشیر ایک پنڈت برہمن کے بیٹے چچ کے ہاتھ آئی جو اسکے دربار میں بااثر بن گیا تھا۔ چچ کا زمانہ آغاز حکومت تقریباً وہی ہے جب کہ نبی امی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہجرت فرمائی۔ اسکے قریب قریب زمانے میں مشہور چینی سیاح ہیون چوانگ نے ہندوستان کی سیاحت کی ہے (سنہ ھ م ۶۲۹ء سے سنہ ۲۶ ھ م ۶۴۵ء تک)۔ چچ نے طوائف الملوکی کا دور کر کی اور ایک سلطنت کی بنا ڈالی۔ اُس وقت دریائے بیاس کے ایک کنارے ایک حصۂ ملک ترک نسل حکمرانوں کے قبضہ میں بھی تھا۔

اس وقت برہمنی مذہب دوبارہ قایم تو ہو گیا تھا لیکن اس کے دوش بدوش بدھ کا اثر بھی

باقی تھا۔ بدھ کی عبادت گاہیں آباد تھیں اور مرتاض بدھ ملک میں ہر طرف عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک کی معاشرت اور مختلف طبقات میں باہم منافرت کی خلیج حائل تھی۔ جاٹ اور لوہان جو قدیم قومیں تھیں اُن سے نہایت ذلت کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ چچ کے بعد اسکا بھائی چندر جس کو بدھ مذہب سے عقیدت تھی اور اسکے بعد چچ کا بیٹا داہر تخت نشین ہوا جو غالباً بدھ کا مخالف تھا اسلئے ممکن ہے کہ وہ عوام الناس میں ہر دلعزیز نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ نجومیوں کے قول سے وہ اپنی بہن سے عقدِ نکاح رسماً عمل میں لایا تھا اور اس فعل کی وجہ سے بھی عام طور پر ہر دلعزیز نہ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک عرب محمد علافی نے ابن اشعث کو قتل کر کے عمان سے جہاز کے ذریعہ سے (جو کھلا ہوا راستہ تھا) پانچ سو اہل قبیلہ کے ساتھ سندھ میں پناہ لی تھی۔ اسکی مدد سے راجہ داہر کو ایک دوسرے راجہ کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی۔ اُس نے اِن نو وارد عربوں کی قدر و منزلت کی اور اُنکو اپنے دربار میں جگہ دی۔ یہ گویا حجاج کے ساتھ چھیڑ تھی۔ اسکے ساتھ ایک اور واقعہ ہو گیا۔ اسلامی اثر سمندر کے راستے سے تجارتی طور پر دن بدن بڑھ رہا تھا۔ سیلون کا راجہ مسلمان ہو چکا تھا۔ عرب تاجر وہاں بس گئے تھے۔ سیلون سے چند جہاز مسلمانوں کو لئے ہوئے عرب جا رہے تھے سواحل ہند پر دیبل کے مید لوگوں سے بعض دریائی لٹیروں نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے اُن جہازوں کو گھیر کر سامان لوٹ لیا اور چند مسلمان لڑکیوں کو بھی پکڑ لے گئے۔ گرفتار ہونیکے وقت ایک لڑکی بے تحاشا چلا اٹھی "یا حجاج" اس "یا حجاج" کی خبر نے حجاج کے دل کو اس طرح تڑپا دیا جس طرح آئندہ زمانہ میں "یامعتصم" نے معتصم کو۔

سواحل ہند پر مسلمانوں کے توطن کے جو روایات ہیں اُن میں کہا جاتا ہے کہ حجاج کے ظلم سے عرب ساحل ہند پر آ کر بس گئے۔ در اصل حجاج کا ظلم نہیں بلکہ اُسکی ہمدردی تھی۔ چونکہ اُس کا ظلم اسلامی تاریخ میں ضرب المثل ہے لہذا بدنصیبی سے اُسکی ہمدردی بھی داخل ظلم ہو گئی۔

فتح سندھ کے تفصیلی دلچسپ واقعات سلطنت آصفیہ کے بحر کرم سے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اردو میں جمع کر دئے ہیں اور اِن سے صاف صاف نظر آتا ہے کہ یہ ملک گیری اگرچہ خلافتِ راشدہ کے مبارک زمانے میں نہ تھی لیکن وہ اصول ابھی تک اسقدر تازہ تھے کہ قریب قریب وہی اثر یہاں بھی مترتب ہوا جو شام، بصرہ، عراق وغیرہ ممالک مفتوحہ خلافتِ راشدہ میں جس طرح شام و مصر ہمیشہ کے لئے اسلامی خطے بن گئے یا یوں کہو کہ اصلی باشندے مسلمان ہو گئے اسی طرح سندھ بھی نیک مزاج فاتحین کے اعلیٰ اور رحمدل برتاؤ کی بدولت اسقدر اسلامی رنگ میں آ گیا کہ آج اُسکی آبادی میں دوسرے صوبہ جات ہند سے یہ حیرت انگیز تباین ہے کہ (۲۵) لاکھ کی آبادی میں سہ ربع سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ کثرتِ آبادی میں ہندوؤں کے قایم مقام یہاں سندھی مسلمان ہیں گویا مسلمان اصلی باشندۂ ملک ہو گئے جیسے شام و مصر میں۔ یہ حیرت انگیز فرق اس امر کا قوی ثبوت ہے کہ جسقدر رواداری برتی جائے اسی قدر اُسکے نتائج قوی اور دیرپا ہوتے ہیں۔ اس آبادی میں گو عربی نسل بھی ضرور ہے لیکن بڑا حصہ اُن سندھی مسلموں کا ہے جن میں اگرچہ تین سو ذاتیں بیان کیجاتی ہیں لیکن اخوت اسلامی اور عربی تہذیب کی بدولت سب ذاتیں ملی جلی رہتی ہیں۔ اور ہر ہر ذات کے جدا رہنے کے قدیم دیسی قواعد ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ مشہور فاتح سندھ محمد بن قاسم اگرچہ سترہ سال کا کم عمر نوجوان ہے لیکن اپنی رائے و تدبیر اور کیرکٹر میں ساٹھ سالہ ثابت ہوتا ہے۔ اور اُسکی عالی مشربی اور بے داغ کیرکٹر کا نمونہ آئندہ بہ مشکل ملتا ہے۔ دراصل تمام انتظام سندھ سے سیکڑوں سے کوس کے فاصلہ پر بصرہ میں حجاج نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اور وہیں سے تمام تفصیلی ہدایات وصول ہوتے تھے۔ ہر تین دن میں ڈاک پہنچتا تھا۔ اگرچہ پیش قدمی خشکی کے راستے سے ہوئی تھی لیکن پانچ منجنیق جہازوں کے ذریعہ سے لائے گئے۔ جن میں سے ہر ایک کے چلانے کیلئے پانچ سو آدمی درکار ہوتے تھے۔ یہ منجنیق دیبل کے محاصرہ میں کس مقام پر کس طور

سے قایم کی جائے۔ اس میں بھی حجاج کی ہدایت کے مطابق عمل کیا گیا اور "عروس" نامی منجنیق نے دیبل کے مشہور مندر کو منہدم کر دیا۔

یہی حجاج ہمیشہ خطوط میں اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ جہاں کوئی قدیم مقام یا مشہور شہر ہو تو وہاں مسجد و منبر ضرور قایم کئے جائیں۔

جسقدر جلد اسلامی اثر پھیل رہا تھا اس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ راجہ داہر کے پاس جو سفارت بھیجی گئی اس میں مولانا اسلامی نام ایک دیسی نومسلم بزرگ بھی تھے۔ جو دیبل کے ہندو شرفا میں سے تھے۔ محمدؒ بن قاسم حیدرآباد سندھ کے حوالی میں دریائے سندھ سے پار اترا۔ ہندوستانی اعتقادات نجوم سے ہراساں ہو رہے تھے۔ دس رمضان ۹۳ھ ۷۱۲ء کو معرکۂ کارزار میں داہر اس بوقلموں دنیا سے اُٹھ گیا اور محمدؒ بن قاسم کا ستارہ اقبال چمک اٹھا۔ بہت جلد تمام سندھ سے ملتان تک اُس کا قبضہ ہو گیا۔ کشمیر تک اس کے حدود قلمرو وسیع تھے۔ اُس زمانہ میں پنجاب کا باین ہیئت کذائی نام و نشان نہ تھا۔ بلکہ وہ سندھ ہی میں داخل تھا۔ پنجاب میں اسلامی آبادی جو زیادہ ہے اس کی وجہ بھی تقریباً یہی برکات قرونِ اولیٰ ہیں۔ پنجاب میں بھی اُن ہی مقامات میں اسلامی آبادی زیادہ پائی جائیگی جو زیادہ تر سندھ و ملتان کے مابین ہیں۔

محمدؒ بن قاسم کا طرزِ عمل محمدؒ بن قاسم کے طرزِ عمل کو خود راجہ داہر کے وزیر سی ساکر نے اسطرح ادا کیا ہے کہ "منصف مزاج امیر نے جو آئین و قوانین جاری کئے ہیں اُن سے تمام ممالک ہند میں اسکی عظمت و لیاقت کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ آپ تمام رعایا اور مالگزاروں کو خوش رکھتے ہیں۔ قدیم مروجہ طریقے ہی سے اور گذشتہ ضوابط کے مطابق آپ مالگذاری وصول کرتے ہیں۔ کسی نئی مستزاد رقم یا جدید ٹیکس کا بار آپ کسی شخص پر نہیں ڈالتے اور اُس کی پابندی صرف خود ہی نہ کرتے بلکہ اپنے تمام عہدہ داروں اور سرداروں کو بھی انہی قواعد کی پابندی کے لئے ہدایت کرتے رہتے ہیں۔"

مندر علیٰ حالہٖ آباد رہے۔ حجاج کے فرمان موجود ہیں کہ کوئی شخص اپنے مذہب کی پیروی سے نہ روکا جائے مسیحیوں کو جو رعایتیں شام میں حاصل تھیں وہی ہندوؤں کو سندھ میں۔ گویا اہلِ کتاب کا سا برتاؤ روا رکھا گیا۔ انتظامِ حکومت بھی انکے ہاتھ میں بحال رکھا گیا جس کا ایک مادی ثبوت قطع نظر روایاتِ کتابی کے، وہ ہندو برہمن موجود ہیں جو عامل کے لقب سے مشہور ہیں۔

پہلی صدی ہجری کا آخری حصہ ہے۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے فتوحات کا دَور دَورہ ہے۔ محمد بن قاسم کی طرح قتیبہ ترکستان میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حجاج نے دونوں سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ "تم دونوں کو بڑھتے ہوئے چین تک جانا چاہئے۔ اللہ کا نام لے کر بڑھتے چلے جاؤ جو پہلے مملکت چین میں داخل ہوگا اُس کو اپنے تمام مفتوحہ بلاد اور نیز اپنے ہمسر سپہ سالار پر حکومت ملے گی"۔

پیش قدمی اصولِ مسالمت پر ہوتی تھی۔ چنانچہ ولید نے اپنی طرف سے ایک خط راجہ قنوج کے نام لکھ کر محمد بن قاسم کے پاس بھیجا کہ یہ خط راجہ کے پاس بھیجا جائے۔ اودے پور تک دس ہزار سواروں کے ساتھ قاصد حکیم شیبانی آیا۔ یہاں سے اُس کا قاصد زید بن عمرو کلابی راجہ قنوج کے دربار میں حاضر ہوا جو اُس وقت ہندوستان کا نامور دربار تھا۔ راجہ نے سخت کلامی کے ساتھ ایلچی کو واپس کیا۔ پیش قدمی کی تیاریاں ہو رہی تھیں لیکن مشیت ایزدی یہی تھی کہ اسلامی سرحد اس وقت اسی حد تک ہو۔ ۹۵ھ میں حجاج مر گیا اور اس کے آٹھ مہینے کے بعد ولید بھی سلیمان کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنانیکے خیالات میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ سلیمان نے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی اپنے تمام مخالفین سے بدلہ لینا ضروری سمجھا۔ قتیبہ اور موسیٰ بن نصیر کی طرح محمد بن قاسم بھی نہ صرف معزول کر کے واپس طلب کیا گیا۔ بلکہ واسط میں قید کیا گیا اور اُسی حالت قید میں یہ نامور فاتح دنیا سے اُٹھ گیا۔ خود

ہندوؤں نے اُس کا سخت ماتم کیا۔ اُسکی یادگار میں اُسکی مورت بنائی۔

بہرنوع حجاج اور محمد بن قاسم نے جو نیا ملک حاصل کیا تھا وہ بدستور اسلامی صوبہ رہا۔ عام طور پر جو یہ خیال تاریخ میں داخل ہو گیا تھا کہ "سندھ کچھ بہت مدت تک مسلمانوں کے تصرف میں نہیں رہا" وہ عربی تاریخوں سے بیخبری کی بنا پر تھا۔ جب سے سندھ اسلامی عملداری میں آیا مغربی ڈپلومیسی کے دور دورہ تک وہ اسلام ہی کے زیر نگیں رہا۔ سر ہنری ایلیٹ اور مولوی عبدالحلیم شرر تاریخ ہند کے اس حصہ کو روشنی میں لاچکے ہیں[1]۔ بلکہ یہ واقعہ بھی نوٹ کے قابل ہے کہ دربار سندھ میں جو عرب پناہ گزیں موجود تھے اور جنھیں واہر کا پسماندہ جے سنگھ اپنے ساتھ کشمیر لے گیا اُن میں حمیم بن سامہ بھی تھا اور جو علاقہ جے سنگھ کو دربار کشمیر سے بطور جاگیر ملا وہ جے سنگھ کے مرنے کے بعد حمیم ہی کو ملا، کیونکہ رعایا اُس سے خوش تھی اور کشمیر کے راجہ اُسکی عزت کرتے تھے۔ چچ نامہ کے زمانہ تک اس علاقہ کی حکومت حمیم ہی کے خاندان میں چلی آرہی تھی۔ کشمیر میں بھی اسلامی آبادی ہی اصلی باشندوں کی آبادی ہے۔

سنہ ۱۰۰ھ میں خطوط اور سفارتوں کے ذریعہ سے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ہند کے تمام راجاؤں کو اسلام کی تبلیغ کی۔ چنانچہ بعض راجاؤں نے اسلام قبول بھی کر لیا۔ دوسری صدی کے اوائل میں ہشام کے زمانہ میں جنید والی سندھ تھا جس نے پھر پیشقدمی کا سلسلہ جاری کیا۔ مارواڑ اور مالوہ تک اسکی پیشقدمی ہوئی۔ اُس زمانہ میں محمد بن قاسم کا بیٹا عمرو بھی سندھ میں آیا۔ اولاً وہ والی وقت حکم کا مشیر خاص تھا۔ حکم نے دریائے اٹک کے دہانہ کے مشرق طرف شہر محفوظہ آباد کیا تھا۔

---

[1] مولوی عبدالحلیم شرر نے سندھ کی تاریخ جس حد تک روشن کر دی ہے اسکے لحاظ سے ضرورت ہے کہ عام طور سے اس کی وسعت کیساتھ اشاعت اور شہرت عمل میں آئے ملک کے علمی اور تعلیمی حلقوں میں افسوس ہے کہ اس سینہ کاوی کا کوئی نمایاں اثر ابتک قایم نہیں ہوا ہے۔ تاریخ تو روشن کیجا چکی ہے لیکن ملک کی ذمہ دار جماعتہائے تعلیمی کو متوجہ کرانے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

عمرو نے بھی اپنی فتح کی یادگار میں دریائے سندھ کے دہانہ کے مغربی کنارے پر منصورہ آباد کیا جو اس کے بعد ایک عرصہ تک سندھ کا دارالامارہ رہا۔

سندھ عرب آبادی کی وجہ سے بالکل شام کا ایک نمونہ نظر آتا ہے۔ عربی وضع قطع جو دمشق میں نکلتی ہے وہ ملتان، منصورہ میں بھی فوراً آجاتی ہے۔ علمی اور مذہبی حلقہ ہائے درس سندھ میں بھی اسیطرح ہیں جسطرح اور دنیائے اسلام میں۔ چنانچہ دوسری صدی کے مشہور محدثین میں ابومعشرالسندی کا نام بھی ممتاز طور پر نظر آتا ہے۔ ابوعطا سندی نامور عربی شاعر ہے اور یہی اثر یہاں کے باشندوں پر پڑتا ہے۔ بقول بی پوسٹن "سندھ کا ہندو آدھا مسلمان ہے"۔ سندھی زبان عربی ادب کے اثر سے بھری ہوئی ہے۔ بہت سے عربی ترجمے اُسمیں موجود ہیں۔

انقلاب حکومت سنت بوبکر و عمر کے عوض سنت کسریٰ و قیصر کو رواج دینے کی بکجت ایک ہزار مہینوں کی مدت پاتر اسی سال میں حکمراں قوت کو نصرتِ اہل بیتِ رسالت کے نام سے سیاہ جھنڈے کے نیچے ہزارہا خراسانیوں وغیرہ سے کچل دیتی ہے۔ لیکن اس انقلاب سے بجائے احیاء حق سنتِ کسریٰ و قیصر کا نشہ دوبالا ہوجاتا ہے۔ بقول امام ظاہریہ ابن حزم "بنی امیہ کی دولت باوجود اپنی خرابیوں کے ایک عربی دولت تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کو مجبور نہیں کیا تھا کہ اُن سے عبودیت اور شاہانہ طریقہ کے ساتھ خطاب کریں یا زمین یا پاؤں کو بوسہ دیں۔ ان کا اصول نہایت دور دراز علاقوں میں اپنی حکمرانی تھی۔ جیسے اندلس، چین، سندھ، خراسان، ارمینیہ، یمن، شام، عراق، مصر، مغرب وغیرہ کل اسلامی دنیا۔ بنی عباس کی سلطنت گویا ایک عجمی (ایرانی) سلطنت تھی جس میں عربی حکومت معدوم ہوگئی اور خراسان کے عجمی برسرِ کار ہوگئے۔ سلطنت ایک کسروی انداز میں آگئی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ کسی صحابی کو علانیہ برا نہیں کہا جاتا تھا۔"[۲]

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ذہبی جلد اول صفحہ ۲۰۲ [۲] ابن عذاری مراکشی کی تاریخ "البیان المغرب" جلد اول طبع یورپ صفحہ ۵۲۔

مسلمان ایرانی عربی سیکھنے کے بعد عربوں کو ہٹا کر اگرچہ دیوانی انتظام پر پھر مثل سابق قابض ہو گئے جو حجاج کے زمانہ میں براہ راست عربوں کے ہاتھ میں لے لیا گیا تھا۔ لیکن جب تک زبردست خلفاء کا ہاتھ موجود تھا عربی اعلیٰ اقتدار قایم رہا۔ اندلس شیرازہ خلافت سے اگرچہ اسی وقت الگ ہو گیا تھا، لیکن باقی اسلامی دنیا بدستور خلافت کے زیر حکم، اور اس میں تمدنی بہار تازہ ہو رہی تھی۔ چنانچہ سندھ میں بھی منصور کے زمانہ میں تازگی پیدا ہو گئی۔ مہدی کے زمانہ میں عمر بن عبد العزیز کی تبلیغی مشن تازہ کی گئی۔ ہندوستان کے بھی بعض راجہ مسلمان ہوئے۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں ہندوستان سے تعلقات اور بڑھ گئے۔ متعدد ہندی اطباء بغداد میں بلائے گئے۔ مامون کے زمانے سے سندھ میں بعض ایسے حکام قایم ہو گئے جنھوں نے بجائے والیِ صوبہ کے راست دربارِ خلافت سے سند حاصل کر لی جسکو آئندہ خود مختار حکومتوں کا دیباچہ سمجھنا چاہیئے۔

تیسری صدی ہجری ترک عربی جمعیت کی جگہ لیتے اور سپہ سالارِ دربارِ عرب بنتے ہیں

عربی خلافت اور ایرانی دیوان کے ساتھ اب ایک اور تازہ جزو فوجی طاقت کا قایم ہوتا ہے۔ سمرقند اور فرغانہ کے ترک غلام جو نسل عرب و عجم دونوں سے الگ تیسری نسل سے تھے شروع شروع میں صوبہ داران ترکستان کے پاس سے بطور تحفہ و ہدیہ دربار خلافت میں پیش کئے جاتے تھے اور وہ دربار کے خاص خدمتی بنائے جاتے۔

طاقت ور فوج یمنی، مصری، خراسانی کی قوت توڑنے کیلئے جسکی خلفاء تاب نہیں لا سکتے تھے، یہ غریب الوطن نووارد، جو مقامی سرغنوں سے بے تعلق ہوتے، خلفاء کے لئے ایک کارگر آلہ ثابت ہوئے اور اسی طرز عمل سے جسکی کامیابی ثابت ہو رہی تھی، بہت جلد انہی کی خاص زرق برق وردی پہنے ہوئی جمعیت بیس ہزار سے زیادہ کی مرتب ہو گئی۔ اور بالآخر وہی سپہ سالارِ دربار عرب بن گئے۔ ان کے رہنے کے لئے خاص "سرمن رای" بسایا گیا۔ عربوں کے اقتدار چھن جانے

پر اُس زمانہ کے شاعر دعبل خزاعی نے اسطرح قومی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

لقد ضاع امر الناس حتیث یسوسھم ؛ وصیف واشناس وقد عظم الخطب

ترجمہ۔ لوگوں کا کام بگڑ گیا جبکہ وصیف و اشناس (دو مشہور ترک افسر) ان پر حکومت کرنے لگے ہیں۔ سخت مصیبت آگئی۔

وھمل ترکی علیہ مھانۃ ؛ فانت لہ ام وانت لہ اب۔ ترجمہ۔ اے معتصم تیرے خیال میں ذلیل ترک ہی بسا ہوا ہے۔ تو ہی اسکی ماں ہے اور تو ہی اس کا باپ۔

معتصم نے عربوں کو دفتر فوج سے خارج کر دیا۔ اور عربی اقتدار کے ضعف کا اِسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انکی حرکت مذبوحی بآسانی ٹھنڈی ہو گئی۔ کسی قوم کا تنزل اُسی وقت ہوتا ہے جب اسکی قابلیت سلب ہو جائے۔ بغداد کے ناز و تنعم نے بطحاء عرب کے جذبات جوانمردی سرد کر دئیے تھے اور سنتِ الٰہی کا عمل لازمی تھا۔

ترک خلیفہ گر بنتے ہیں

معتصم سمجھتا تھا کہ یہ نئی فوج خاندان خلافت کیلئے قوت بازو ہوگی لیکن سنت اللہ قومی طاقت کے زوال کے ساتھ قوم کی حکمراں ہستی باقی نہیں رکھتی۔ معتصم کا مرنا ہی تھا کہ اسکے کمزور جانشینوں کے زمانہ میں یہی سمرقندی غلام خلیفہ گر بن گئے اور تمام پیش بینی اکارت گئی۔

کان مملوکی فاضحی مالکی ؛ ان ھذا من اعاجیب الزمن۔ ترجمہ۔ میرا غلام میرا آقا بن گیا۔ یہ عجائبات زمانہ سے ہے۔

دعبل کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔

وانی لارجوان تری مغیبھا ؛ مطالع شمس قد یغض بھا الشرب۔ ترجمہ۔ مجھے امید ہے کہ اپنی مغرب سے آفتاب نکلے گا۔ اور زندگی تلخ ہو جائیگی۔

اسلام کا ہمہ گیر جذب اور اصول مساوات ترکستان و تاتار کے صحراؤں میں کچھ ایسی نسلی افراط ہے کہ بارہا جب متمدن دنیا ترفہ اور عیاشی کے دلدل میں پھنسی ہے تو ان صحراؤں سے ایسی آندھی اٹھتی ہے جو اس دلدل کو صاف کر دیتی ہے۔ مشرق اور مغرب، ہند و چین ہر جگہ اس کے کشتے نظر آئیں گے۔ عربوں پر ترکی اثر کا یہ پہلا ورق تھا جس کو اسکے بعد آنیوالے شدید اثرات کا دیباچہ سمجھنا چاہئے۔ بے شبہ ان دل بادل ایرانی و ترکی قوموں کے عربوں پر اس شدت سے چھا جانیکے بعد عربی مذہب کی ہر وقت تازہ رہنے والی جلا اس دعویٰ کی قطعی دلیل ہے کہ اگر عرب صرف ایک قومی جذبہ کی بدولت کام کرنے والے ہوتے تو رومنس کیطرح وہ کب کے نیست و نابود ہو چکے ہوتے۔ یہ صرف اسلام کے ہمہ گیر جذب کی تاثیر ہے کہ باوجودیکہ وہ شائستہ ایرانیوں سے لیکر نیم مہذب ترکوں اور وحشی مغلوں اور زنگیوں تک کو اپنے میں لے لیتا ہے۔ لیکن وہ روحِ مساوات اور توحید فنا نہیں ہونے پاتی جسکے لئے اسلام دنیا میں آیا۔ تاریخ اسلام ایک قومِ عرب کی تاریخ نہیں ہے۔ بلکہ ایرانی ترک اور مغل بھی اسکے دوامی اجزا بنگئے ہیں۔

صوبوں کی خودمختاری

طاہریہ دربار خلافت کی کمزوری کے ساتھ شیرازۂ خلافت کا بکھرنا لازمی تھا۔ اندلس تو شروع دورِ بنی عباس سے ہی آزاد ہو گیا تھا، اب ایران وغیرہ کی بھی باری آگئی۔ صوبہ دار اس حالت میں آگئے کہ دربار انکو معزول نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر ان میں بھی وراثتی جانشینی مسلمہ دستور تھی۔ خراسان کا صوبہ دار طاہر ذوالیمینین جس نے امین کو شکست دی تھی ظاہر ہے کہ امین کے دربار کو شکست دینے کیلئے بغیر خراسانی فوجوں کے مامون کچھ نہیں کر سکتا تھا، گویا بجائے خود مستقل بن گیا جسکو آئندہ چل کر دربار بھی معزول نہ کر سکتا تھا۔ اسکے حدودِ حکومت خراسان سے غزنی اور سیستان تک تھے۔ اسکے بعد اس کا

لایق بیٹا اس کا سچا جانشین تھا۔ جو قوانینِ سنتِ الٰہی معتصم کے بعد بغداد میں تُرک غلاموں کو خلیفہ گر بنا رہے تھے اس چھوٹے سے خاندان میں بھی ان کا عمل اُسی تیزی سے ضرور تھا۔ بہت جلد آلِ طاہر بارِ امانت کے اہل نہ رہے۔ وہ عیش و عشرت کے خوگر ہو گئے اور عظمت الٰہی نے ایک صفار (ٹھیٹرے) کو کسروی قلمرو کی تاجداری اس بنا پر نصیب کی کہ وہ نہایت جفاکش، محنت کا خوگر اور حکومت کی اہلیت رکھتا تھا۔ چنانچہ خود رائے عامہ نے حکومت کا بوجھ اُسکے کندھوں پر رکھا۔

صفاریہ | خود مختاری کی یہ دوسری منزل تھی۔ پہلے دور میں تو خود دربار سے حکومت عطا ہوئی تھی۔ اس دور میں خود بزور قابلیت حکومت تسلیم کرائی گئی۔ خاندان صفار کی حکومت آلِ طاہر کے حدود حکومت سے زائد ہو گئی جسکی وجہ یہ تھی کہ دربار خلافت کا اثر اور کمزور ہو گیا تھا۔ چنانچہ صوبہ سندھ جو اُس وقت تک راست دربار خلافت سے متعلق تھا وہ بھی خود دربار سے بروے سند صفاریہ کے حدود حکومت میں شامل کیا گیا۔ یا دوسرے الفاظ میں سندھ کے صوبہ دار وقت عمر بن عبدالعزیز ہباری نے بھی صفاریہ کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کیا۔ دائرۂ اقتدار جسقدر سکڑتا جاتا ہے اسیقدر خود مختاری کی لہریں ابھرتی جاتی ہیں۔ اموی دور میں یا تو ایک ہی وائسرائے بصرہ سے لیکر سندھ تک کافی تھا یا یہ حالت ہے کہ حکومت در حکومت بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ مثلاً دربار بغداد میں جو حیثیت حاکم خراسان کی ہے وہی حالت حاکم سندھ کی فرمانروائے خراسان کے پاس ہے۔

سامانی خاندان | ایک ہی ہمہ گیر اصول کا اثر نمایاں ہے۔ بہت جلد صفاری نسل بھی حکومت کی اہل نہ رہی۔ آلِ سامان جو تاجدار ایران بہرام چوبیں کی نسل سے ہیں سمرقند میں اپنا مشہور زمانہ معارف گستر دربار جماتے ہیں۔ اور چونکہ یہ مرکز سندھ سے بہت دور ہے لہذا یہاں بھی اس خود مختاری کا عمل زور سے ہونے لگتا ہے۔

سندھ کی خودمختار عربی حکومتیں | ایک صوبہ سندھ میں ہی متعدد عربی النسل حکومتیں قایم ہوتی

ہیں جنہیں منصورہ اور ملتان کی ریاستیں زیادہ مشہور ہیں جو دورِ عرب کی یادباقی رکھتی تھیں۔

بنی بویہ | بالکل ایک سا نمونہ پر آلِ سامان بھی کمزور جانشینوں کی وجہ سے فنا ہونے لگتے ہیں بنی بویہ کی عظمت کا ڈنکا بجتا ہے[1]۔ یہ بھی ایرانی نسل سے اور دیلم کے باشندے تھے۔ سندھ میں بھی انکی اعلیٰ حکومت تسلیم کیجاتی ہے۔ مشہور بویہی فرمانروا عضد الدولہ نے قفص اور بلوص کی جو راہزن قومیں تھیں پوری سرکوبی کی۔ اُسکے زمانہ میں یہ مسلمان بھی ہوئے۔ مولوی عبدالحلیم شرر کی رائے میں بلوص بلوچ اور قفص افغان ہیں[2]۔ بلوص کا بلوچ ہونا تو بالکل قرینِ قیاس ہے۔ لیکن قفص کا افغان یا اقل درجہ افغ ہونا محل نظر ہے۔ افغانی قوم جو بمرورِ زماں ایک ملک میں بسنے کی وجہ سے آج بظاہر ایک نسل معلوم ہوتی ہے درحقیقت مختلف النسل والجنسیت قوموں کا مرکب مجموعہ ہے۔ مشہورِ زمانہ علامۂ جمال الدین افغانی نے اسبارہ میں محققانہ طور سے اپنی کتاب تاریخ افغانستان میں بحث کی ہے۔

اسلامی دنیا جوشِ تشیع سے بھری ہوئی ہے

اب یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اسلامی دنیا تشیع کے جوش سے بھری ہوئی ہے۔ ابومسلم خراسانی کا ماٹو نصرت اہل بیت ہی تھا اور اس وقت تک بنی علی اور بنی عباس ایک ہی تھے۔ جب خلافت بنی عباس کے ہاتھ میں چلی گئی تو دونوں کی جدائی ناگزیر تھی۔ جب تک بنی عباس میں زبردست فرمانروا برسرِ حکومت رہے بنی علی کی کوششیں سرسبز نہ ہوسکیں۔ خلفاء کا ضعف، عربی اقتدار کی کمی، ترکوں کی چیرہ دستی، قومی معاشرت میں ترفہ کا مبالغہ جس سے عوام الناس اور امرا میں تفرقہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ ان سب باتوں نے ابومسلم خراسانی کی مشن کو پہلے سے زیادہ شدید مذہبی رنگ میں نئے نئے انداز کے ساتھ رنگنا شروع کردیا۔ چنانچہ قرمطی تحریک کے ذریعہ سے ۲۷۸ھ میں امام غائب کی طرف دعوت آغاز ہوئی۔ چند ہی سالوں میں اس دعوت نے بحرین میں زبردست سیاسی

---

[1] محلات شاہی کی نوبت نوازی انہی کی یادگار ہے ۱۲ [2] صفحہ (۴۰) جلد اول اور صفحہ (۱۲۱) جلد دوم تاریخ سندھ۔

طاقت حاصل کرلی۔ ان سیاسی یا معاشرتی انقلاب پسندوں کی پیدایش چونکہ خود سوسائٹی کے فاسد مادے تھے لہذا ایک طرف سے انکے اکھیڑ دئے جانیکے بعد پھر دوسری جانب وہ منہ بنانے لگتے اور اسطرح چوتھی صدی کے ابتدائی حصے میں ان نذر من چلے انقلاب پسندوں نے نہ صرف بصرہ اور کوفہ لوٹ لیا بلکہ دربار خلافت کو تھرا دیا۔ بغداد کے خود ترکوں کی نازپروردگی کا اندازہ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ستائیس سو قرمطی اسی ہزار کی شاہی ترکی فوج پر بھاری ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں عبداللہ مہدی نے جو یمن سے افریقہ چلے گئے تھے[1] مغرب میں مستور و مخفی امامت کو جس کا اس بیتابی کے ساتھ انتظار تھا عالم آشکارا کردیا۔ اسطرح یہ قرمطی رشن اس دعوت اسمٰعیلیہ کی طرف جھک پڑا اور اپنے حلقہ ارادت میں اس کا قدم تیز کرنے لگا۔ باطنیت کے پردے میں بیت اللہ کی حرمت ضروری نہ سمجھی گئی۔ قرمطی رشن[2] اور بویہی حکومت جو بغداد پر قابض تھی تشیع کے عالم گیر اثر میں پرزور حصہ لے رہی تھی جس زمانہ میں عضدالدولہ نے بلوچستان کا نام پیدا کردیا ہے تو اسی زمانے میں المعزالدین باللہ تمام مصر و شام حرمین تک اپنا اقتدار قایم کرکے قاہرہ کو دارالسلطنت بناتا ہے۔ زبردست مذہبی اور دنیوی اقتدار کے ساتھ بزم حکمت میں مسکویہ اور بوعلی بھی راگ الاپتے ہیں۔

(سنہ ۳۶۰ھ) لیکن چندہی قدم آگے بڑھنے کے بعد اس بوقلموں دنیا میں یہ طرفہ ماجرا نظر آتا ہے کہ قرامطہ و داعیان امام متغلب عباسی کے جھنڈے کے نیچے بنی بویہ جیسے حامیان تشیع کی پرزور مدد سے خود امام پر یورش کرنے لگتے ہیں لیکن معز کے تازہ دم افریقی (بربر) سپاہی بغداد کے نازپروردہ ترک نہ تھے۔ اس ٹکر سے قرمطی رشن اسمٰعیلی امام کو زبردست مدد پہونچا کر خود اسطرح فنا ہوگیا جسطرح کہ اگلے زمانہ میں ابومسلم خراسانی بنی عباس کو قایم کرکے خود انکے ہاتھ سے مقتول ہوچکا تھا۔

---

[1] عبداللہ مہدی کی تحریک کا نشوونما اولاً یمن میں ہوا تھا (سنہ ۲۷۰ھ)

[2] دیلم نومسلم تھے حسن بن علی علوی الطروش کے ہاتھ پر یہ مسلمان ہوئے تھے۔ (سنہ ۳۰۲ھ)

اسمٰعیلیت سواحل ہند میں | اسمٰعیلیت کی حیرت انگیز ترقی کا نظارہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ قاہرہ کے مرکز اسمٰعیلیت ہونیکے پندرہ سال کے بعد مشہور سیاح مقدسی ۳۷۵ھ میں ملتان کو بالکل اسمٰعیلی اثر میں پاتا ہے۔ انہی کا خطبہ اور سکہ جاری تھا۔ ملتان کے تعلقات قاہرہ کے ساتھ حیرت انگیز طور پر قایم تھے۔

بحری راستہ | جس چیز نے ملتان کو قاہرہ سے وابستہ کر دیا وہ بحری راستہ ہے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ عربوں کا تجارتی اثر جہازوں کے ذریعہ سے سواحل ہند پر بڑھتا جا رہا تھا۔ حجاج کے زمانہ میں منجنیق جہازوں کے ذریعہ سے ہی دیبل لائے گئے تھے۔ اس راستے سے ہر مذہبی یا سیاسی تحریک کا اثر بھی سواحل ہند پر بآسانی پہنچ جاتا۔ بلکہ بسا اوقات خلافت یا حکومت کے پنجے سے نجات پانے کیلئے سواحلِ ہند کے دامن کھلے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پناہ گیرانِ راجہ داہر۔

چنانچہ منصور کے وقت بنی علی کی جو تحریک ہوئی اُس میں عبداللہ اشتر بن محمد اُسی راستے سے سندھ میں آئے اور ایک ہندو راجہ کے پاس مہمان ہوئے۔ اگرچہ خلافت کی اس وقت کی زبردست طاقت سے آخر اشتر نے بھی اپنے باپ اور چچا کی طرح جوانمردانہ جان دی لیکن اس طور سے زیدیت' جو بقول مولوی عبدالحلیم شرر دنیا میں شیعیت کا پہلا فارم تھا' سندھ میں قایم ہوگئی۔

اصل یہ ہے کہ عربوں کی بحری و تجارتی تاریخ بالکل تاریکی میں ہے۔ حالانکہ وہ اُنکی سیاسی تاریخ سے نتایج میں بڑھی ہوئی ہے۔ اگر توفیق ربانی مساعد ہوئی تو انشاء اللہ المستعان بہت جلد وہ روشنی میں لائی جائے گی۔ مختصر یہ ہے کہ سمندر مصر و عرب سے چین تک عربوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اُن تمام ممالک کی باہمی اور انکے ذریعہ سے یورپ اور افریقہ کی تجارت کے مالک ہیں۔ اگر ہزاروں شیوخ اسلامی دنیا میں خانہ بر انداز میدان سیاست و کارزار سے الگ خدمت مذہب و علم میں وقف ہیں اور اس اثر کے سامنے وہ ترک خون آشام تلواریں بھی جو خلفا کو اجل کے گھاٹ اتارتیں سرِ تسلیم خم

کرتی ہیں تو اُسی طرح سیکڑوں شیوخ تبلیغی مشن میں پُرخطر سمندر کے راستے اور پُرامن تجارتی طریقے سے حواریانِ حضرت مسیحؑ اور منادیان بدھ کی طرح اُن سے بدرجہا زیادہ زبردست کامیابی حاصل کررہے ہیں۔ اسی راستے سے چین میں مسلمانوں کی کثیر آبادی اصلی باشندوں کا جزو بنجاتی ہے۔ جزائر بحر ہند اور ہندوستان کے تمام ساحل پر عرب ہی تجارت کے مالک ہیں۔ ہندو راجاؤں کے زیر حمایت وہ مسجدیں بناتے اور تبلیغی کام انجام دیتے ہیں جس میں ذات کی تفریق انکی بڑی معاون تھی سواحل پر اسلامی آبادی کی حالت سندھ سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اور بقول پروفیسر آرنلڈ" اس میں ہرگز شبہ نہیں کہ ہندوستان میں اسلام کو اپنی اشاعت میں بڑی اور مستقل کامیابی ایسے اوقات اور مقامات پر ہوئی ہے جہاں مسلمانوں کی سیاسی طاقت بہت ہی ضعیف تھی"۔ یہ اثر ایسا زبردست ہے کہ مابعد ترک مغل فرمانروایانِ ہند کی صدیوں کی حکومت بھی اسکی نظیر سے خالی ہے۔

غرض اسمٰعیلیہ نے بحری راستے سے سواحلِ ہند میں اپنا مستقل اثر پیدا کرلیا مصر کی حکمرانی نے بلحاظ اپنے موقع کے تمام دنیا کی تجارت پر اسمٰعیلیہ کو اقتدار دیدیا تھا جیسا کہ لی بان نے تصریح کی ہے۔ اور یہی انکی حیرت انگیز ثروت کا بڑا ذریعہ تھا۔ لیکن اسمٰعیلیہ کا یہ اثر ساحل گجرات تک محدود رہا اس سے آگے سواحل ملیبار و کارومنڈل اسمٰعیلیت سے پاک اور قدیم پرانے اسلامی عام جماعتی اصول پر برقرار رہے جیسا کہ اس وقت تک بھی وہی حالت برقرار ہے۔

خاندانِ سبکتگین | وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ کے اصول کے مطابق جب بنی بویہ کا ستارۂ اوجِ اقبال پر تھا تو ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی۔ آلِ سامان میں جب معمولی اسبابِ ضعف پیدا ہونے لگے تو اسی دربار کے ایک ترک غلام الپتگین نے غزنی میں اپنا دربار الگ جمایا۔ اسی الپتگین کا غلام سبکتگین تھا جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ نیزدگرد آخری تاجدارِ ایران کی نسل سے تھا[1] اور حوادث

---

[1] فرشتہ بحوالہ تاریخ منہاج السراج جرجانی

زمانہ کے ہاتھوں ترک غلام بنکر البتگین کے ہاتھ بکا۔ اسلام کے اصولِ مساوات اور سوسائٹی کی عام معاشرت کی بدولت وہ اپنے آقا کا داماد بنگیا۔ اور جب آقا کا بیٹا دو سال کی حکومت کے بعد مرگیا تو سبکتگین فرمانروائے غزنی تھا (۳۶۷ھ) یہی ناموز سبکتگین اور اس نامور باپ کا نامور بیٹا محمود ہندوستان کی تاریخ میں انقلابِ حکومت اسلامی کے بانی بنتے ہیں سبکتگین باہمی نزاعوں کی خار دار جھاڑی میں الجھنے کے عوض مہلب کے نقش قدم پر پنجاب کا رخ کرتا ہے (۳۶۷ھ) جسکی چھیڑ خود جے پال نے کی تھی۔ اور اپنی تازہ ہمت ترک و افغان فوجوں سے ہندوستان کی فوج پر کامیابی حاصل کرتا ہے

ہند پر پیش قدمی | بنی امیہ کے بعد ہندوستان میں پیشقدمی کا جو سلسلہ باہمی نزاعوں کی وجہ سے بند ہوگیا تھا ایک زبردست طاقت ہندوستان کی سرحد پر قایم ہوجانے سے اب اسکو مکرر جاری کرنے کا موقع آگیا۔ لیکن دونوں حالت میں ڈھائی سو برس کا ممتد زمانہ گزر جانیکے بعد جو فرق پیدا ہوگیا اس کا خلاصہ اس طور پر کیا جاسکتا ہے۔

پہلی پیشقدمی کے وقت سپہ سالار اور حملہ آور فوج کا بڑا حصہ عربی النسل ہے جو نبی عربی علیہ السلام کی زبان بولنے والی ہے۔ خیر القرون کا زمانہ قریب ہی تھا جسکی وجہ سے وہی اصول وہدایات تازہ تھے۔ اجتہاد آسان ہے۔ عیاشی نے زیادہ گہرا رنگ نہیں جمایا تھا۔ دربار خلافت بھی عربی تھا۔ دمشق سے ہند تک ایک ہی قلمرو ہے۔ سپہ سالار احکام وائسرائے کا اور وائسرائے احکام خلافت کا پابند ہے۔ ڈھائی سو برس کے بعد اب یہ فرق ہے کہ دربارِ خلافت عقیدت مذہبی کی بنا پر قایم ہے۔ بنی عباس اور عرب اقتدار حکومت سے عاری ہیں۔ دیوانی اقتدار ایرانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ علمی اور مذہبی حلقوں میں بھی ایرانی اور ترکی ہی غالب ہیں۔ عربی زبان کا اقتدار بھی بہت گھٹ گیا ہے۔ عربی ادب وشاعری کے قدرداں مٹ چکے ہیں۔

ایرانی معاشرت کے ساتھ ہی ایرانی زبان بھی اس حصہ دنیا، اسلام کی عام اسلامی زبان تھی۔

فارسی کے عام غلبہ کا اس سے زیادہ اندازہ کس چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایرانیوں کے پرانے تاریخی رقیب ترک بھی اب اسی زبان اور معاشرت کے پابند تھے۔ ایک قلمرو کے عوض کئی مطلق العنان قلمرویں جو باہم ہمیشہ دست و گریبان رہتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ فوجی اقتدار عام طور سے غلامانِ ترک کے ہاتھ میں ہے ہر جگہ انہی تازہ خون ترکوں کی جدید بھرتی ہوتی رہتی ہے۔ ان اختلافات قومی جنسی اور لسانی کو متحد بنانے والی چیز مذہب ہے اور اس سے حسب بیان سابق جسطرح ایک طرف اسلام کے ہمہ گیر جذب کی خاصیت ظاہر ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ اس گرہ کشائی کا راستہ ملتا ہے کہ مابعد پیشقدمی سے وہ نتائج کیوں مترتب نہیں ہوئے جو ابتدائی پیشقدمی سے اسطرح ظاہر ہوئے کہ ملک کی اصلی آبادی مسلمان ہوگئی اور جس پر آئندہ روشنی ڈالی جائے گی۔

محمود غزنوی ۳۸۷ھ م ۹۹۶ء سی سالہ نوجوان مگر سنجیدہ محمود کو جب ایک منتظم حکومت ورثہ میں ملگئی تو اب راستہ بالکل صاف تھا۔ نہ صرف پنجاب، جواب بجائے وسیع سندھ کے ایک حصہ کے بطور جدید جغرافیہ میں داخل ہوا تھا اسلامی صوبہ بنگیا۔ اور محمد بن قاسم کا مدتوں سے فراموش شدہ تخیل محمود نے اپنے قنوج میں داخلہ سے پورا کیا۔ بلکہ ملتان اور سندھ کو بھی اسمٰعیلیت کے اقتدار سے چھڑاکر اپنی قلمرو میں داخل کرتے ہوئے گجرات کے سومناتھ میں جا پہنچا۔ اسقدر طویل سفر اسکی خوش تدبیری کا نمونہ ہے تو قنوج کے مہاراجہ کے ساتھ اس کا برتاؤ اسکی حسن سیرت کی قوی شہادت ہے جس کو مغربی مصنفوں نے اسقدر مہیب شکل میں دکھایا ہے

دربار غزنی کی بدولت ایک طرف ہندوستان میں اسلامی عملداری کا دروازہ کھل گیا تو دوسری طرف اسمٰعیلیت اور تشیع بویہی کے روز افزوں اقتدار کو ایک سخت ضرب لگی اور اسکے ساتھ ہی علم و حکمت کی ترقی میں جانِ تازہ آگئی اور اس میدان میں بھی دربار غزنی سامانی اور بویہی درباروں سے آگے بڑھ گیا۔ غزنی اس وقت دنیا کا نامور دار العلوم تھا۔ ابوریحان بیرونی جیسا فخر حکماءِ اسلام

جس نے اسی زمانے میں ہندوستان آکر سنسکرت میں کمال حاصل کیا اسی دربار کی آرایش ہے۔ اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فوج کشی کے ساتھ ہی ہندوستان کی علمی تحقیقات کس بلند ترین درجے تک پہنچ گئی جس پر آج بھی بہت کم اضافہ ہو سکا ہے شمشیر بازانِ اسلام علم و حکمت کو بھی اُس طرح جلا دیے ہے تھے جس طرح فرزندان ارض مغرب۔

فارسی کی گرم بازاری اب بجد بڑھ گئی اور گویا ایران اسلامی رنگ میں زندہ ہو گیا۔

جانشینانِ محمود اسلامی عہد کے اس عام نقص، خود سری نے جو ہر وقت اور ہر جگہ نظر آتا ہی جانشینان محمود کو بھی باہمی جنگ و جدل میں مصروف کر دیا۔ اسمٰعیلیت پھر بھری راستے سے بہت جلد اپنی سابقہ حالت پر قایم ہو گئی۔ اور ملتان بدستور اُن ہی کے اقتدار میں تھا مستنصر فاطمی کے شصت سالہ دور حکومت میں جو عہد اسلام میں سب سے زیادہ طویل المدت فرمانروا گزرا ہے۔ اسمٰعیلی نقیب و داعی تمام اطراف عالم میں پھیل گئے۔ بویہی اور غزنوی وغیرہ دربار سست ہو گئے تھے بہت ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے بعد پھر ایک شیرازہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

آلِ سلجوق اس وقت تک جتنے ترک آئے وہ کسی دربار کے متوسل رہتے تھے جو عربی یا ایرانی نسل ہوتے لیکن ان درباروں کے سست ہو جانے کے بعد کوئی وجہ نہ تھی کہ ترک خود عصائے حکومت نہ اٹھالیں جن کی تلواریں ہی ہر دربار کی زینت تھیں۔ تازہ وارد ترکان آل سلجوق جنھوں نے اولاً اسلام کو پامال کیا، حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہیں۔ اور اب خود اپنا ایک پرسطوت دربار جماتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی طاقتیں انکے دائرہ اقتدار میں جذب ہو جاتی ہیں۔ ایران سے شام تک انہی کی حکومت کا آفتاب چمکتا ہے۔ عربی زبان کے نفوذ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے جبکہ دفتری زبان جواب تک عربی رہی تھی، ان اجنبی سلجوقی ترکوں کے زیر حمایت فارسی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ آل سلجوق علمی سرپرستی میں کوئی کمی نہیں کرتے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ علم و ادب میں جمود آجاتا ہے۔ علم و فن آگے بڑھنے کے عوض

پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ سوسائٹی کی خرابیاں قرمطیت کے عوض اب باطنیت کے رنگ میں اور زیادہ ہمانے لگتی ہیں۔ طرہ یہ کہ نصرانیان یورپ ارض مقدس کے دعویدار بنتے ہیں اور حروب صلیبیہ کا زمانہ آغاز ہوتا ہے۔ سلجوقی اور اسمٰعیلی ہٹ بھیڑ اس کا راستہ دیتی ہے اور ارض مقدس پر اُن کا قبضہ بھی ہو جاتا ہے۔ (۴۹۳ھ) اگرچہ ترکان سلجوق میں بھی بہت جلد خود سری کی منازعتیں برپا تھیں لیکن بہر نوع یہی ترک نسل فاروق اعظمؓ کی مفتوحہ ارضِ مقدس پر دوبارہ اسلامی جھنڈا قایم کرنے میں کامیاب رہی۔ نورالدین وصلاح الدین جیسے ترک مدافعین اسلام نے نہ صرف نصرانیانِ فرنگ کو ناکام یورپ واپس جانے پر مجبور کر دیا بلکہ مصر کی اسمٰعیلی سلطنت کی بھی جو معمولی اسباب زوال سے فنا ہو رہی تھی جگہ لے لی۔ اسلام کا اثر کیا چیز ہے کہ نومسلم قومیں جب اس دام میں پھنستی ہیں تو ہمیشہ کیلئے اُسکی حلقہ بگوش ہیں۔

دربارِ غور جس طرح ادھر سلجوقی ترک ابھر رہے تھے اسیطرح غوری خاندان ابھرا۔ اس خاندان کی نسل ایران کے ضحاک سے ملائی جاتی ہے جو عربی النسل تھا۔ بہرحال کوئی نسل ہو وہ صدیوں سے غور کا متوطن خاندان تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ محمود غزنوی کے خوف سے وہ سواحلِ ہند میں بھاگ گیا اور تجارت شروع کی۔ بہرنوع پھر دربار غزنی میں ہی اُس خاندان کا وہ سیاسی نشوونما ہوا جسکی بدولت غور کی صوبہ داری اس کو ملی۔ جس اصول پر دربار سمرقند سے غزنی کا دربار الگ جما بعینہٖ اُسی اسلوب پر غور کا تازہ دم جنگی اسپرٹ دربار غزنی سے علیحدہ قایم ہوا۔ گو اس میں غوری الوطن فوج ہو لیکن فوجی اقتدار اُس وقت کی متمدن دنیا کے ہر حصہ کی طرح یہاں بھی ترک غلاموں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے جنکی ہر وقت تازہ بھرتی ہوتی رہتی ہے۔ الحاصل جب غزنوی شان وشوکت غور میں منتقل ہوگئی تو ایک مستعد تازہ دم حکمراں اور اُسکے قوت بازو بھائی سپہ سالار کے بدولت پھر پیشقدمی کا دورہ آیا۔ چنانچہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اس سپہ سالار محمد غوری نے ملتان اور سندھ میں اسمٰعیلی پھر قایم شدہ زور کو توڑتے ہوئے دہلی میں اسلامی عملداری اسی سنۃ التاریخ کے مطابق قایم کر دی۔ جسکو اس وقت کے دیسی حکمرانوں کی گو وہ بھی باہری

سے آکر دوسری جگہ بسے تھے، باہمی نااتفاقی، قوت انتظامی کی کمی، ترفہ کی کثرت، نظام معاشرت کی خرابی، امرا اور عوام کے عدم تعاون، حالات زمانہ کی بے خبری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ (۵۸۸ھ[۵۱]) تلوار اگر اپنی انتظامی حکومت قایم کرا رہی تھی تو اسکے ساتھ ہی یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ مبلغین اسلام چند توں سے سواحل ہند پر اپنا مستقل اخلاقی و مذہبی اثر قایم کر چکے تھے۔ اور پنجاب میں تو پہلے سے کافی اسلامی اثر موجود تھا۔ اب خود ہندوستان کے دل میں اپنا گھر بنا رہے تھے۔ دہلی میں اسلامی جھنڈا لہرانیکے پیشتر خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ اپنے عزیز وطن کی دلچسپیوں کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ کر اجمیر کی پہاڑیوں میں وہ روحانی اثر تازہ کر رہے تھے جو غار حرا سے تمام دنیا پر عالمگیر اخوت کے جذبہ کی تکمیل کیلئے روشن ہوا تھا اور یقیناً اس وقت کے باشندگان ملک کو یہ روحانی اثر سری کرشن اور بودھ کی مدتوں کی بھولی ہوئی تعلیم یاد دلا رہا ہوگا۔

بابِ دوم

ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت

شہاب الدین محمد غوری کے جاں باز اور باہمت غلامان ترک سپہ سالاروں قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی (ترک) نے ترک و تاجیک و افغاں فوجوں سے شمالی ہند سے بنگالہ تک اسلامی عملداری قایم کر دی۔ نبی امی علیہ السلام کی عام تعلیم مساوات و توحید کا اثر ہے جس نے عربوں سے ایک بہت دور اور بالکل بے تعلق انہی کی طرح امی قوم کو اس رنگ میں رنگ دیا کہ وہ اسکے نام لیوا بن کر ایک

---

۵۱ عجائب الاسفار۔

طرف ارض مقدس فلسطین پر اسی مذہب کا اقتدار باقرار رکھیں تو دوسری طرف ہندوستان میں بعثت نبوی کے چھ سو برس کے بعد اسلامی حکومت قایم کریں۔

ایبک کے ترک غلام اور داماد شمس الدین التمش نے جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ بغداد کی سوسائٹی میں زندگی بسر کی تھی۔ دہلی کو اُس وقت کی دنیا کے مرکز تہذیب و وضعداری بغداد کا نمونہ بنا دیا۔ حوض شمسی عراق کے مشہور ذرائع آبرسانی ہی کی تقلید تھی۔ بغدادی معاشرت اور بغدادی کارگری دہلی میں اسکی ہندی سابقہ معاشرت و صناعی سے جداگانہ نیا رنگ جمانے لگے۔ فخر الملک عصامی جس نے بغداد میں تیس سال وزارت کی تھی، دہلی میں آکر التمش کا وزیر بنا۔

نظام حکومت | کسریٰ و قیصر کی جو سنت بدبختی سے پہلی صدی کے نصف میں ہی اختیار کیجا چکی تھی، اور جسکے خوں فشاں نتائج مسلسل خاندانوں کے تخت الٹتے رہتے تھے وہ ہندوستان میں بھی اس قہمندی کے ساتھ موجود تھی۔ فرمانروائی ناتجربہ کار اور نااہل اولاد جب کام بگاڑنے لگتی تو اس وجہ سے کہ ابھی ابھی تازہ حکومت تھی لہذا تخت خود بہت جلد موزوں اور اہل فرمانروا کا انتخاب کرلیتا چنانچہ ایبک کے بعد جب اُس کا بیٹا نااہل نکلا تو خود امرا نے التمش سے درخواست کی۔ اسیطرح التمش کی اولاد نااہل کے برخلاف نیک نفس ناصر الدین محمود اسکے سب سے چھوٹے بیٹے کو خود امراء دربار نے بھرٹروچ سے طلب کرکے بادشاہ قرار دیا جس کے زمانہ میں التمش کا ترک غلام اور داماد بلبن مدار المہام تھا۔[۱]

مغل | اب تماشہ گاہ عالم میں نیا پردہ اٹھتا ہے۔ معتصم کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک جن باشندگان ترکستان نے عربوں کی غلامی سے تاج شاہی حاصل کیا وہ ترک تھے۔ یہ وہ قوم تھی جو ایران سے متصل بستی تھی۔ اب ترکستان بھی ناز پروردہ ہوکر زبردست اور جری فوجوں کو پیدا کرنیسے عاجز آرہا تھا۔ نیز معاشرت میں بدترین خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں جن میں ترک عربوں سے زیادہ رنگیلے بنگئے تھے۔

---

[۱] التمش اور بلبن بھی سبکتگین کی طرح شہزادے تھے جو غلام ہوکر بکے۔ عجائب الاسفار

اور جن کی وجہ سے باطنیت یورپ کے انارکزم کی رہنمائی کر رہی تھی۔ انکے خاتمہ کیلئے ناموسِ تاریخ کے عام اور ہمہ گیر اصول کے مطابق ایک زبردست سیلاب کی تیاری ہو رہی تھی۔ ترکستان کے اوراوپر سے اس وحشی، خانہ بدوش، قیامت آفریں قوم مغل کی آمد آمد کا شور محشر مچا جو وسط تاتاریں بستے اور ترکوں ہی کے ہم نسل تھے (۶۰۲ھ) جس سال محمد غوری کی شہادت ہوئی اسی سال چنگیز کا نام بلند ہوا جس کو قدرت نے جہاں کشائی کی نئی طاقت بخشی۔ آل چنگیز کا نام قتل و غارت کیلئے یادگار رہ گیا۔ اِدھر ہندوستان میں ترک اسلامی تہذیب و تمدن کی بہار تازہ کر رہے تھے تو اُدھر مغل ترکستان اور وسط ایشیا میں ناز و تنعم کا خاتمہ کر رہے تھے۔ ہر طرف سیلاب خون کی گرم بازاری تھی۔ وحشیانِ مغل نے ادھر بغداد (دار السلام) کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ رسم پرستی اور باطنیت دونوں کو کچل ڈالا (۶۵۶ھ) تو اِدھر ہندوستان کا بھی تبت اور افغانستان دونوں طرف سے رُخ کیا۔ لیکن دونوں جگہ ہندوستان کے مسلمان ترک چنگیزی مغلوں کی مدافعت میں کامیاب رہے۔ کیونکہ شمشیر آزمائی کا جوہر ابھی تازہ تھا۔ اسوقت جبکہ اسلامی دنیا میں قیامت برپا تھی تو دہلی خانہ برباد مسلمان نامور اور باعظمت خاندانوں کیلئے پناہ گاہ تھی۔ برباد شدہ ریاستوں کے بیسیوں شاہزادے اور شرفا دہلی میں آسرا پاتے تھے۔ اس ترکی اور مغلی (یا مسلم اور غیر مسلم) باہمی کش مکش کی بدولت ہندوستان کی اسلامی حکومت کو جنوبی ہند میں پیشقدمی کا موقع نہ تھا۔ جیسا کہ خود بلبن نے صراحت کی ہے۔[۱]

خلجی خاندان بلبن کا جانشین پوتا (کیونکہ اس کا نامور بڑا بیٹا مغلوں کی مدافعت میں شہید ہوچکا تھا) جب عصائے حکومت اٹھانے کے قابل نہ رہا تو دربار کے ایک ذی اثر رکن بلکہ مدار المہام جلال الدین خلجی[۲] نے ساتویں صدی کے آخر آخر (۶۸۸ھ) میں محمد غوری کے حملہ کے ایک صدی بعد باتفاق امراء

---

۱ حسب تصریح ضیاء برنی۔ ۲ یہ بھی ترک قوم تھی لیکن ایک عرصہ سے افغانستان میں بس گئی تھی اور اسطرح ترکوں سے متمائز حیثیت رکھتی تھی

عصائے سلطنت خود اٹھالیا۔ یہی سنتِ مستمرہ ماقبل کی طرح مابعد بھی نظر آتی رہے گی۔ انقلابِ خاندان کا سبب اور اثر بعینہ وہی ہوتا تھا جو خود ایک خاندان کے نااہل بادشاہ کی علیحدگی اور اُسی خاندان کے ایک موزوں بادشاہ کے تقرر کا ہو۔ موروثی نظامِ حکومت کا نقص اور حسنِ انتظام کی عام خواہش خود اس تبدیلی کی داعی ہوتی۔ غرض اسطرح جلال الدین خلجی نے پھر انتظام حکومت قایم کر دیا۔

مشایخ طریقت ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام نے جو اثر ڈالا اُس کا سب سے اہم جزو وہ روحانی کوشش ہے جو مشایخ طریقت نے لازوال طور پر سرزمینِ ہند میں اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ اُسی جاہ و جلال کے زمانہ میں جب کہ نشۂ دولت اور ترفہ سے سلمان فاتحین متوالے بن رہے تھے یہ سماں کسقدر پر اسرار و دلکش معلوم ہوتا ہے کہ بزرگانِ طریقت کا فقیرانہ دربار الگ جما ہوا ہے جو باقاعدہ طور سے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھتے ہیں اور دولت کے اُس عام برگ ریز زمانہ میں سادہ زندگی کے بورئے اور جوار کی روٹی پر قناعت کرتے ہیں۔ مافوق العادت اور اس زمانہ میں ناقابلِ وثوق ریاضتوں سے نفسِ سرکش یا پُر طمع اور خود پسند فطرتِ انسانی کو رام بناتے۔ روحانی طاقت کو مجلا کرتے۔ اور اس طرح تمام فرزندانِ مادرِ ہند کے دلوں میں عام اس سے کہ وہ مسلمان حکمران جماعت سے ہوں یا یہاں پہلے سے آئی ہوئی مختلف الطبقات سوسائٹیاں۔ نہ مٹنے والی حکومت کا سکہ جماتے ہیں۔ یہ مشن اُسی طرح اپنے کام میں مصروف نظر آتی ہے جسطرح زمانہ حال کے مسیحی مشن۔ وہ ہندوں کے آباد اور معاشرتی مرکزی مقامات میں جاکر بستے اور اپنی ریاضت سے جوگ اور ہندی فلسفہ کی تہ کے اندر گھس کر اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ تمام ملک میں سلسلۂ خلافت پھیلا دیتے ہیں۔ اور ہر جگہ ایک منتظم اصول پر کام ہوتا ہے جس سے نظر آتا ہے کہ ایک ہی سالویشن آرمی کے ماتحت اجزا ہیں جو مطلق اپنے مقررہ اصول اور قواعد سے انحراف نہیں کرتے۔ اس اہم اثر پر تاریخی نگاہ سے عقیدت مندی کی نظر سے علیحدہ۔ اس وقت تک حقیقت میں کافی غور و توجہ نہیں کی گئی ہے لیکن دراصل یہ ایک مہتم بالشان اور قابل غور تاریخی

مسئلہ ہے جس پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔

ایک صدی میں ملکی انقلاب کے ساتھ کسقدر معاشرتی تغیر ہندوستان کی اس قدامت پسند سرزمین میں پیدا ہوگیا تھا۔ دراصل یہ شنری اس غیر فانی آرگنائیزیشن کا ایک جز تھی جو تمام اسلامی دنیا کے اعلیٰ معنوی اقتدار کا باعث رہی ہے۔ زرخرید ترک غلاموں کا علم بردار اسلام بن جانا زیادہ تعجب خیز نہ تھا۔ لیکن یہ واقعہ کہ خلافت کو نیست و نابود اور عربی تہذیب وتمدن کے پامال کرنے والے' عربوں کے دین اسلام میں داخل ہونے کو اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیں اور خود اپنے ہاتھ سے خاک میں ملائی ہوئی تہذیب کے محافظ بنجائیں بقول آرنلڈ" ایک عجیب وغریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہے جب کہ بودھ نصرانیت' اسلام اس جدوجہد میں تھے کہ ان وحشی' ورظالم مغلوں کو مطیع بنائیں[1] بالآخر اس میدان جنگ میں اسلامی ظاہری اور باطنی تہذیب وروحانیت نے بودھ اور نصرانیت کو شکست دے کر تاتاریان مغل کے دلوں میں اپنی فتح مندی کا جھنڈا گاڑ دیا[2]"

سنت اللہ "بعضکم لبعض عدوٌ" اور" دفع اللہ الناس بعضھم ببعض" کا جلوہ قوموں میں یکساں نظر آتا ہے۔ وہی آل چنگیز و ہلاکو چند ہی سالوں میں باہمی نزاعوں میں مبتلا تھے اور وہی ہیبت زا فوج جس سے تمام متمدن دنیا تھرا اٹھی تھی باہم دست وگریبان تھی۔

اسطرح تخت دہلی کو مغلئی حملہ آوری سے جب بیفکری ہوگئی تو گویا اب جنوبی ہند (دکن) میں اسلامی پیشقدمی کا وقت آگیا۔

دکن میں اسلامی فوج کشی

ادھر خلجی طاقت کو بیرونی خدشہ رفع ہوگیا تو ساتھ ہی ادہی معمولی اسباب زوال جو تمام قوموں کو یکساں

---

[1] ہلاکو کا بیٹا نکودار احمد مسلمان ہوچکا تھا۔ البتہ اعلان نہ کرسکا تھا۔ غازان سب سے پہلا مغل بادشاہ ہے جس نے اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ [2] دعوت اسلام صفحہ ۱۴۱۔

نگاہ قہر سے دیکھتے ہیں۔ اُس وقت کی دکنی حکومتوں میں جو باہر سے آکر یہاں حکمراں بنے تھے۔ اپنے آخری درجے کو پہنچ چکے تھے۔ قدیم ارین باعظمت قوم کا نظام حکومت اور معاشرت شمالی ہند کی طرح یہاں بھی مختل تھا۔ قوم میں وہ اوصاف جو بناء حکومت کے وقت تھے اب مفقود تھے۔ باہمی بے تعلقی بلکہ سخت نفرت اور حالات زمانہ سے بیخبری شمالی ہند کی طرح یہاں بھی زوروں پر تھی۔ قدرت نے اسلامی فاتحین کیلئے اسطرح راستہ صاف کر دیا تھا جسطرح اس سے پہلے آریا کیلئے اور اسکے بعد اقوام ارض مغرب کیلئے اور اسطور سے سلطان علاء الدین خلجی کیلئے فاتح دکن ہونا مقدر تھا۔

قدیم تاریخ ہند | تسلسل مضمون کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ قدیم پر کسیقدر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ ہندوستان کو اکال الامم کہا گیا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ آریہ ہندوستان میں باہر سے آئے اور تقریباً اسیطرح آئے جسطرح مابعد زمانہ میں مسلمان جسطرح مسلمان پنجاب سے آتے آتے بتدریج تمام ہندوستان میں پھیل گئے اسی طرح آریہ بھی پنجاب سے آتے آتے آخری ساحل ہند تک پہونچے۔ تاریخ اگرچہ ان اقوام شمالی ہند کی کوئی یادتازہ نہیں رکھتی جو آریہ کی بدولت جنگلوں میں بس گئے۔ لیکن جنوبی ہند کی تاریخ آرین تاریخ سے پرانی ہے۔ قوم ڈراویڈ اسوقت بھی مہذب حکمراں قوم تھی جب آریہ یہاں آئے ہیں۔ پردیسی آریہ ہندوستان میں بس کر ہندو کہلائے جانے سے پیشتر یہاں اور ہی رنگ اور چہرے کے ہندو بستے تھے۔ یہ پرانے ہندو جو گونڈ، بھیل، پاڑوی وغیرہ ناموں سے اب بھی قدامت کی یادتازہ کرتے ہیں ہزارہا سال کے انقلابوں کے بعد بھی ہزارہا سال کے بتدریج ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے مقابلہ میں انسانی فطرت کی قدیم سادہ زندگی کا نمونہ دکھا رہے ہیں۔ اور بقول لی بان ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں تمدن اور فطرت کا مقابلہ نہایت آسانی سے ممکن ہے اور جسکی کوئی نظیر کسی جگہ نہیں ملسکتی۔ ان پرانی قوموں کے عادات و رسوم میں ایک قابل لحاظ طریقہ بجائے جلانے کے مردوں کا دفن کرنا ہے[۵] جس سے

---

[۵] رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۸۹۰ء جلد دوم۔

پتہ چلتا ہے کہ قدیم طریقہ انسانی عادات کا دفن ہی تھا۔

ان پرانی قوموں کے بعد دکن میں آثار تمدن کا نشان دراوڑ قوم کی مختلف شاخوں سے چلتا ہے جو تلنگے، کنڑے، اروے وغیرہم ہیں[۱] جنکی بہت سی عمارات و آثار ابتک باقی ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ دکن کے ہندو آریہ نسل سے علاقہ نہیں رکھتے بلکہ اصلی باشندوں سے زیادہ نسبت رکھتے ہیں[۲]۔ گویا انہی کی ترقی یافتہ نسل تھی۔ رنگ اور چہرے کی ساخت کے علاوہ زبان اس کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ السنہ جنوبی ہند اروی، کنڑی، تلنگی جو اس ملک کی قدیم زبانیں ہیں، بخلاف مرہٹی کے سنسکرت سے بالکل جداگانہ ہیں۔ تلنگی اور مرہٹی میں جو بین فرق ہے وہ ہر زبان داں کے پاس مسلم ہے۔

غرض دکن کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ شمالی ہند یا آریہ ورت میں آرین تمدن پھیلنے کے پیشتر وہ راہ ترقی میں قدم زن ہو چکا تھا۔

جنوبی ہند کا تمدن آریا سے بہت قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زامورن (سامری) قوم ہی ساحل جنوب سے عراق میں جا کر بسی اور اسیریا و بابل کے تمدن کی وہی بنا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ملیبار سے ہی مصری تمدن کی بنا قایم ہوئی۔

آریا نے گو اس تمدن کو فنا کر دیا اور مذہب کو بھی کچھ بدل دیا۔ لیکن ان پرانی زبانوں کو نہیں مٹا سکے جو السنہ بسیط میں داخل ہیں۔

آرین امتزاج سے ایک نئے دور کی بنا قایم ہوئی۔ اس موقع پر قدیم تاریخ سے بحث کرنی ہمارے مقصد سے خارج ہے[۳]۔

---

[۱] نواب عماد الملک کی "قلمرو آصفیہ" انگریزی صفحات ۴۲۔ [۲] بہترج مختصر تاریخ ہند صفحہ ۱۶۔ [۳] مسودہ میں مرحوم نے یہاں نوٹ لکھا ہے کہ "لیکن سلسلہ کلام کے لحاظ سے یہ ظاہر کر دینا ضرور ہے کہ جس وقت مسلمان ہند میں آئے یہاں مذہب اور معاشرت اور تمدن کی کیا حالت ہو رہی تھی"۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اسکو مکمل کرنے کا موقع نہیں پایا۔

بابِ سوم

اِسلامی فتوحاتِ دکن

سُلطان عَلاءُالدّین خلجی فاتح دکن علاءالدین اپنے چچا اور خسر جلال الدین خلجی کے زمانے میں کڑہ کا صوبہ دار تھا[1] کڑہ الہ آباد سے بائیس میل شمال غرب میں واقع ہے۔ الہ آباد کا قلعہ تعمیر ہونے سے پہلے جو اکبر نے بنایا اس علاقہ کا صوبہ دار کڑہ میں رہا کرتا تھا[2]۔ کڑہ سے اُس نے اولاً بھیلسان[3] پر فوج کشی کی جہاں سے اسکو بہت غنیمت ہاتھ لگی۔ یہیں اُس نے دیوگیر (دولت آباد) کے تمول و دولت کی خبر سنی اور اُس کا راستہ بھی اُس نے دریافت کیا۔ دیوگیر اس وقت مرہٹواڑی راج کا دارالحکومت تھا۔ اس نے تین چار ہزار سوار اور دو ہزار پایک (پیدل) تیار کئے[4] اور ایلچ پور (برار) کے راستہ سے گھٹی (گھاٹی) لاجورہ (راجورہ) میں بکایک پہنچ کر اپنا جھنڈا بلند کر دیا۔ اس وقت رام دیو راجہ دیوگیر کی فوج اسکے بیٹے کے ساتھ کسی دُور علاقہ میں گئی ہوئی تھی۔ دیوگیر کی مخلوق نے اس وقت تک کسی مسلم فاتح کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ دیوگیر کی حالت اس وقت یعنی ساتویں صدی ہجری کے خاتمہ پر یا ۶۹۵ھ میں قریب قریب اُس طرح قیاس کیجا سکتی ہے جسطرح دہلی اور قنوج کی اس سے ایک صدی بیشتر شہاب الدین محمد غوری کے حملے کے وقت حکمرانانِ وقت کی جنھوں نے دراصل مسلم فاتحین کیطرح اس

---

[1] ضیا برنی صفحہ ۲۲۱۔ [2] عجائب الاسفار صفحہ ۶۲ [3] بھیلسان ضیا برنی نے بھیلسان لکھا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالوہ کا علاقہ ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں صوبہ مالوہ کے تحت سرکار اجین، سرکار ہنڈیہ، سرکار رائے سین و چندیری بتانیکے بعد سرکار رائے سین میں بھیلسہ بھی لکھا ہے یہی ضیا برنی کا بھیلسان معلوم ہوتا ہے (آئین اکبری جلد اول طبع کلکتہ صفحہ ۳۸۱) [4] ضیا برنی صفحہ ۲۲۲۔

سے پہلے یہاں تازہ وارد ہو کر سابق اقوام کی جگہ بالجبر حاصل کی تھی، باہمی منازعتیں، پھر تفریق در تفریق اور افراد شاہی خاندان، امرا، مقامی رؤسا خود سری کی ہوس میں سرمست تھے۔ حالات زمانہ سے بیخبری، ضابطہ اور انتظام کی کمزوری، عیش پسندی، نظام معاشرت کی خرابی، امراء و عوام کا باہم عدم تعاون۔ شمالی ہند کی بہ نسبت دکن میں حاکم و محکوم میں اور زیادہ اختلاف قومی مذہبی و جنسی لسانی موجود تھا۔ تلنگانہ اور کرناٹک کو مرہٹواڑی سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ بہرکیف جب رام دیو کو اس تازہ وارد فوج کی خبر ہوئی تو اس نے مدافعت کی کوشش کی لیکن علاء الدین کو اسی طرح انہی حالات واسباب میں کامیابی حاصل ہوئی جس طرح محمد غوری کو شمالی ہند میں، اور علاء الدین کی مختصر مگر جانباز اور تازہ جوش سے بھری ہوئی فوج کا جلوس بغیر کسی خونریزی کے اس شاندار، متمول شہر دیوگیر میں داخل ہو گیا۔ شہر فتح ہو جانے کے بعد رام دیو نے قلعہ میں پناہ لی بالآخر صوبہ ایلچ پور (برار) کی سپردگی پر صلح ہو گئی[۵]۔ بہت بڑی دولت علاء الدین کے ہاتھ آئی جس سے ایک صدی پہلے زمانہ فتح دہلی کی یاد تازہ ہو گئی۔

اس جدید فتح دیوگیر کا نقارہ جلال الدین خلجی فرمانروائے عصر کے دنیا سے کوچ کا نقارہ تھا۔ دیوگیر کی مہم اس اصلی فتح تخت دہلی کیلئے تھی۔ بقول ضیاء برنی وہ سمجھ گیا تھا کہ "گرہ لشکر بسیار مستعد مرتب تواں کرد و ممکن است کہ از کڑہ دہلی دست آید زر می باید"۔ چنانچہ اس بنا پر وہ یہ چاہتا تھا کہ "جائے دور دست برود زر بسیار بیارد۔ شب و روز از مسافراں و جہاندیدگاں تفحص اقالیم اطراف می کرد"۔ غرض علاء الدین نے جلال الدین کے خون سے ہاتھ رنگ کر تخت دہلی پر قدم رکھا۔ ایسے جرائم کے ارتکاب کی علت خود سوسائٹی کا منحوس اثر تھا۔ اب اس زمانہ میں قومیت نے شخصیت کی جاے لیلی ہے لیکن اُس وقت تک نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی شخصیت ہی واقعات تاریخ کا محور ہوتی تھی۔ اور ان جرائم کا منشا حفاظت خود اختیاری کا فطرتی جذبہ۔ علاء الدین کیا کرتا جبکہ بادشاہ کے بیٹے ولی عہد سلطنت کے علاوہ ملکہ جہاں (ساس)

---

[۵] فرشتہ۔

اور خود بیوی کی سخت ناموافقت سے اسکو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

علاء الدین کے قوانین علاء الدین نے جو اکبر کی طرح بالکل امی تھا تخت دہلی پر قدم رکھنے کے بعد ثابت کر دیا کہ درحقیقت وہ اُس کا مستحق تھا۔ فوج کشی کے وقت وہ ایک بہادر و دور اندیش سپہ سالار تھا تو امن کی حالت میں نہایت بیدار مغز اور مدبر۔ ترکوں کے سلطان سلیمان قانونی اور اکبر کے آئین و قوانین کی طرح قوانین علائی بھی کچھ کم قابل ستائش نہیں حقیقت یہ ہے کہ علائی قوانین ہی امتداد زمانہ کی وجہ سے مابعد مقننین کی طرف منسوب ہو گئے ہیں۔

(۱) تنخواہوں کا معیار اعلیٰ رکھنا علاؤ الدین کے طبع نکتہ سنج کی ایجاد ہے۔ "مصرفان وعہدہ داران را آنقدر مواجب تعین کنند کہ ایشاں را بہ آبرو بگذرد"[1]

(۲) نرخ اجناس کا تعین اس کا شاندار کارنامہ ہے۔ اگرچہ چند روز پہلے تک یہ ایک ناجائز طریقہ سمجھا جاتا تھا لیکن اس عالمگیر جنگ نے جو نئی روشنی پیدا کر دی ہے اُس کے لحاظ سے اس طریقہ کی عمدگی نمایاں ہو گئی ہے۔ اس اصول میں وہ اسقدر کامیاب ہوا کہ بقول مورخین عصر اس سے پہلے کبھی اس عہد کی سی ارزانی نہیں ہوئی تھی۔ ضوابط کی تفصیل ضیا برنی میں موجود ہے[2] اور اُن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جرمن ماہران فن دولت نے انہی کی تقلید کی ہے۔ یہ ضوابط اسقدر وسیع اور مکمل ہیں کہ ان پر اضافہ دشوار ہے۔

(۳) انسداد مسکرات۔ مورخین عصر نے تصریح کی ہے کہ سزاؤں کے ذریعہ سے اُس نے اس میں اسقدر کامیابی حاصل کی تھی کہ جرائم کا ارتکاب ہی گویا مٹ گیا تھا۔

علائی قوانین کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بالکلیہ عملی اصول پر مبنی تھے اور اسلئے وہ صرف کاغذ پر لکھے ہوئے نہیں رہ گئے بلکہ انکی تعمیل اس موثر طریقہ سے کرائی جاتی تھی کہ بہت بڑی حد تک سوسائٹی کے

---

[1] ضیا برنی صفحہ ۲۹۲ [2] ضیا برنی صفحہ ۳۰۴

قدیم نقایص اصلاح پذیر ہونے لگے تھے اور عام طور پر کاروبار میں خوش معاملگی پیدا ہوگئی تھی۔

ابن بطوطہ نے بھی علاء الدین کے زمانہ کے امن و امان، آئین و ضوابط کی بیحد توصیف کی ہے۔ جسکے قریب زمانہ میں ہی وہ ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت تک اُسکی یاد بالکل تازہ تھی۔ ابوالفضل کو بھی، باوجودیکہ اس نے علاء الدین کا اچھے الفاظ میں تذکرہ نہیں کیا ہے، یہ تسلیم کرنا پڑا کہ "آئین ہائے شگرف برنہاد"۔

فتح دکن | جب سلطنت مضبوط ہاتھوں میں ہو اور انتظام قایم ہو جائے تو خود بخود فار ورڈ پالیسی سامنے آجاتی ہے۔ اب فوج سے کیا کام لیا جائے؟ یہ سوال ہر وقت علاء الدین کو اپنی طرف مشغول رکھتا تھا۔ ایک اولوالعزم واقف اسرار فطرت سے یہ راز جہانگیری و سکندری چھپا ہوا نہیں رہ سکتا کہ کسی جرار لشکر کے سامنے کام مہیا رہنا چاہیئے ورنہ پھر وہی فوج محافظ تاج و تخت کے حق میں بلائے جاں ستاں بنجاتی ہے۔ علاء الملک کوتوال جو ضیاء برنی کا چچا تھا اور علاء الدین کے جو مکالمے ضیاء برنی نے نقل کئے ہیں۔ اُن سے ان تمام اسرار سیاست پر پوری روشنی پڑتی ہے[1]۔

غرض شمالی ہند میں جو راج باقی رہ گئے تھے انکو بخوبی مطیع و منقاد بنا یا گیا۔ تاتاری غیر مسلم مغلوں کے حملہ مضبوطی سے بند کر دئے گئے۔ جب شمالی ہند بے خوف و خطر ہو گیا اور گجرات اور کھمبایت بھی علائی عملداری میں شامل ہو گئے تو اب لامحالہ دکن کیطرف پیشقدمی کا وقت آگیا۔

کافور وسپراسائے دکن | اس فتح دکن کا سہرا کافور کے نام سے باندھا ہوا ہے۔ کافور کے ابتدائی حالات نامعلوم ہیں کہ وہ دراصل کس قوم سے اور کہاں کا باشندہ تھا۔ تاریخ میں اس کا ابتدائی داخلہ اس طور سے ہوتا ہے کہ کھمبایت سے یہ خوش رو کافور ہزار دیناری اپنے مسلمان تاجر آقا کے پاس سے بالجبر چھین کر لایا جاتا اور دربار علائی میں پیش کیا جاتا ہے[2]۔ جس طرح سمرقند و فرغانہ کے غلام بغداد کے دربار خلافت

---

[1] ضیاء برنی صفحہ ۲۶۷ [2] فتح گجرات کے بعد نصرت خاں سپہ سالار کھمبایت گیا جو گجرات کا قدیم تاریخی بندرگاہ ہے۔ ضیاء برنی لکھتا ہے کہ اس نے خواجگان کھمبایت سے جو نہایت مالدار ہو گئے تھے بہت سے جواہر و نفائس حاصل کئے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

میں ترقی پاکر سپہ سالار بنجاتے ہیں اسی طرح خوش رو کافور ہزار دیناری نے جو دربار کے مقامی لیڈروں سے بالکل اجنبی تھا، بہت جلد اپنی جانبازی اور وفاداری کے ثبوت پیش کردیئے اور سلیمان شاہ کی بغاوت کے وقت جبکہ علاء الدین خطرناک طور پر زخمی ہوگیا تھا کافور نے جواب "ملک[۱] کافور" بن گیا تھا مسلح ہوکر حرم سرائے شاہی کی سر بکف محافظت کی۔ اسطرح بادشاہ کو اس پر نہایت اعتماد تھا۔ چنانچہ سپہ سالار افواج دکن ہونا اس کی قسمت میں مقدر تھا۔ اس وقت اس کو "ملک نائب" (والیسرائے) کا عالیشان خطاب حاصل تھا۔

بقول ضیاء برنی یہ امر تاریخ میں ہمیشہ عجوبہ خیز رہے گا کہ فتح دکن کیلئے ایک خواجہ سرا کا انتخاب کیا جائے جسکے پورے انسان (مرد) ہونے میں بھی شبہ ہے۔ اس خواجہ سرا کے ماتحت ایک لاکھ عظیم الشان جرار فوج دیجائے اور پھر اسکو سائبان، لعل اور سراپردہ کے خاص شاہی لوازم سے اعزاز بخشا جائے۔ ملک نائب کافور کے اسٹاف میں انتظام کی غرض سے خواجہ حاجی "نائب عرض ممالک" مامور کیا گیا۔ جسکی صفت نیک مرد حلیم الطبع بیان کی گئی ہے

کافور کا پہلا حملہ کافور کا پہلا حملہ ۶۰۶ھ میں ہوا۔ اور اسکی وجہ یہ ہوئی تھی کہ رام دیو نے عہد نامہ کے شرایط کی تعمیل میں کئی سال سے معینہ رقم پیش کش نہیں کی تھی۔ نیز رائے کرن گجرات کے راجہ کی تائید کرکے کوہستان بگلانہ میں اسکو قدم جمانے کی اجازت دی تھی۔ کافور نے بہ تعمیل ہدایات علاء الدین ثابت کردیا کہ اس کا مقصد لوٹ مار نہیں ہے بلکہ انتظام قایم کرنا ہے۔ مورخین عصر نے تصریح کی ہے۔ "ملک نائب چوں بہ دکن آمد سکنۂ آں ولایت را در ظل حمایت و شفقت خویش جائے دادہ آزار مورے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) اور کافور ہزار دیناری کو نصرت خاں نے اسکے خواجہ سے بہ زور لے لیا اور سلطان علاء الدین کے پاس لایا تھا۔ خواجگان کھمبایت سے مراد وہاں کے مسلمان تاجر ہیں جو سواحل پر آباد اور اس زمانہ میں تجارت اور جہاز رانی کے مالک تھے جیسا کہ پیشتر بھی ہم نے جابجا صراحت کی ہے۔ [۱] "ملک" کا خطاب سلطان محمود غزنوی کی ایجاد ہے جسے وہ اپنے منظور نظر اشخاص کو دیا کرتا تھا (فرشتہ)

نہ پسندید۔ ومانندطباشیر صبح گاہی شربت کافوری بہ کام تشنہ لباں آں دیار ریختہ ہمگی رعیت وسپاہ راطیع و منقاد ساخت۔" افسوس ہے کہ ایسے اہم نکات کو جوان فتوحات کی روح رواں ہیں اور سلسلہ علت و معلول کے لحاظ سے یہی چیزیں قابل تذکرہ ہیں۔ مروجہ تصانیف میں نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ کافور اس نمایاں فتح کے بعد رام دیو کو ساتھ لے کر دربار علائی میں حاضر ہوا۔ علاءالدین نے جس عزت کے ساتھ رام دیو سے ملاقات کی اس سے اسکی قوی شہادت ملتی ہے کہ علاءالدین کوئی بدمزاج، خونخوار، درشت خو شخص تھا جیساکہ مروجہ تاریخوں میں اسکی تصویر بتائی گئی ہے بلکہ اکبر کے پیشترگویا اسکو اپنی بلند مشربی کا نمونہ دکھانے والا تھا۔ رام دیو کے ساتھ پورے شاہانہ لوازم برتے جاتے تھے بقول مورخ عصر" خلایق درگاہ فرقے میان او و بادشاہ نمی نہادند" شاہی علامت چتر سفید کے استعمال کی اسکو اجازت دیگئی" رائے رایاں" خطاب دیا گیا۔ اس طرح وہ اسلامی تاریخ کا پہلا" رائے رایاں" ہے۔ دیوگیر اور اوسکے متعلق پورے سابقہ علاقہ کی حکومت بحال رکھی گئی۔ قصبہ نوساری واقع گجرات بادشاہ کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی اور باعزاز تمام رشتہ داروں اور بچوں کے ساتھ بغیر کسی کے ضمانت میں رکھ لینے کے جیسے کہ اسکے مابعد زمانہ میں بھی دستور تھا، واپس جانے کی اجازت عطا ہوئی۔ یہی علائی الطاف خسروانہ تھے جس نے رام دیو کو بھی مدت العمر کیلئے تخت علائی کا وفادار دوست بنا دیا۔ یہ شائستہ برتاؤ فتوحات دکن کا یادگار واقعہ رہے گا۔

کافور کا دوسرا حملہ ۷۰۹ھ دیوگیر کے وفادار ریاست بن جانے کے بعد اب مزید قدم آگے بڑھانے کا موقع آیا۔ چنانچہ ۷۰۹ھ میں کافور ورنگل پر بھیجا گیا۔ کافور کو اس مہم کے متعلق جو ہدایت دیگئی اس سے ظاہر ہے کہ یہ مہم لوٹ مار کی غرض سے نہ تھی بلکہ کل ہندوستان میں ایک اعلیٰ حکومت تسلیم کرانے کے لئے۔ ہدایت یہ ہے کہ اگر لدادیو (رودر) ورنگل کا راجہ پیش کش گزرانے اور سالانہ خراج کا ذمہ دار ہو جائے تو مہم کی کارروائی طے شدہ سمجھی جائے۔ ورنگل اور مملکت تلنگانہ کے فتح کرنے کی ضرورت نہیں

حسب سابق خواجہ حاجی اب بھی "چیف آف دی اسٹاف" تھا۔ اور کافور کو ہدایت تھی کہ تمام انتظامات میں اسکی رائے پر عمل پیرا ہو۔ رائے رایاں رام دیو راجہ دیوگیر نے اس مہم میں حق رفاقت ادا کیا۔ جب دیوگیر سے اسلامی فوجیں آگے بڑھ کر اُن مقامات میں جانے لگیں جہاں ابتک کسی مسلمان فاتح نے قدم نہیں رکھا تھا تو رام دیو چند منزلوں تک خود ساتھ آیا اور اپنے علاقہ کے بہت سے سوار و پیدل حفاظت لشکر اور راستہ بتانے کیلئے ساتھ دئے اور رسد رسانی کا بندوبست کیا۔ براہ اندور (نظام آباد) جہاں سے کہ حد تلنگانہ کا آغاز تھا کافور بلا مزاحمت ورنگل جا پہونچا اور اُس کا محاصرہ کرلیا۔ دہلی سے ورنگل تک مسلسل ٹپہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ اسکی تفصیل ضیا برنی نے دی ہے[۵]۔

ورنگل کے دو حصار تھے۔ ایک اندرونی پتھر کا جس میں راجہ خود تھا۔ دوسرا اسکے باہر مٹی کا جس میں فوج تھی۔ سنگ مغربی[۶] دونوں طرف سے چلتے رہے۔ محاصرین نے سیڑھیاں لگائیں۔ کمند پھینکے اور آخر باہمت محاصرین جرأت کر کے مٹی کے بیرونی حصار کے برجوں پر پہنچ گئے اور اسطرح شہر کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ رودر دیو نے دیکھا کہ اب سنگی حصار کی بھی نوبت آتی ہے تو اُس نے فوراً صلح کرلی۔ بہت سا زر و جواہر ہاتھی گھوڑے گزرانے اور سالانہ پیشکش کا بھی اقرارنامہ لکھدیا۔ اس نوبت پر یہ مہم ختم ہوگئی۔

کافور کا تیسرا حملہ کرناٹک پر ۱۱۳۱۰ھ ہندوستان کی آخری سرحد تک پہونچنے کیلئے اب کرناٹک باقی رہگیا تھا۔ مہم ورنگل کے دوران میں جب چند روز تک ٹپہ بند ہوگیا تو جانشین حضرت خواجہ اجمیر حضرت

---

[۵] ضیا برنی صفحہ ۳۳۱۔ [۶] سنگ مغربی جو ضیا برنی نے لکھا ہے اس سے کیا مراد ہے تحقیق طلب ہے۔ لغت کی کتابوں میں کوئی داخلہ نہیں ملا۔ محمد تغلق نے جب ۱۳۲۱ء میں ورنگل پر دوبارہ حملہ کیا تو اس وقت بھی سنگ مغربی اور عزارہ کا استعمال بیان کیا گیا ہے۔ عزارہ تو غالباً عرادہ ہے جس سے چھوٹی منجنیق مراد ہوتی تھی (عجائب الاسفار) سنگ مغربی سے خاص قسم کا گندک وغیرہ سے تیار شدہ مواد معلوم ہوتا ہے جو منجنیق کے ذریعہ سے پھینکا جاتا تھا منجنیق کا استعمال توپ کے پہلے اس دور میں جاری تھا۔ فرشتہ نے "سرکوب" لکھا ہے۔

محبوب الٰہی قدس سرہ کی بشارت علاء الدین کے سمندِ شوق کو تازیانے کا کام دے رہی تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی سال کافور بدستور حاجی خلیفہ کے ساتھ دہور سمدر (دوار سمدر) اور معبر (کارومنڈل) کی جانب بھیجا گیا۔ یہ سفر بھی بدستور دیوگیر پرسے ہوا۔ اس وقت یار وفادار رام دیو دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ اور اس کا بیٹا اُس کی جگہ راج کر رہا تھا۔ جسکی وفاداری مشتبہ تھی لہذا بنظر احتیاط جالنہ کے قریب ایک سردار فوج متعین کیا گیا اور اسلامی فوجیں اب اپنی ہی رہنمائی اور بندوبست سے آگے بڑھیں۔ کٹھن علاقہ پرسے گزرتی ہوئیں تین مہینے کے عرصہ میں بنادر دریاے عمان (سواحل ہند) و اقصیٰ بلاد دکن میں جا پہونچیں۔ بلال دیو راجہ کرناٹک (علاقہ میسور) گرفتار ہوا اور پیشکش کی ادائی قبول کرنے پر رہا کر دیا گیا۔

مسجد علائی

سیت بندر امیشور (راس کماری، نقطہ اختتام ہند کے پاس پہنچ کر ایک مسجد بنائی گئی اور اس طرح کافور نامور آرین ہیرو رامچندر جی کے نقشِ قدم پر جا پہنچا۔ اس مقام پر پھر یہ یاد دلانا نامناسب نہ ہوگا کہ ساحل ہند، سپہ سالار فوج کے حکم سے بنائی ہوئی مسجد کے صدیوں پیشتر سے بھی مالک بن دینار وغیرہ کی مسجدوں سے اذان کی آواز سن رہا تھا۔ اور آج بھی سواحل ہند کی نہایت قدیم مسجدیں اور اسلامی کثیر آبادی گواہ عادل ہے کہ اسلام براہ پنجاب فوجی ترک و احتشام کے ساتھ آخری نقطہ ہند پر پہونچنے کے صدیوں پیشتر پرامن ذریعہ سے جہازوں کے راستہ سے سواحل ہند پر بطور مستقل اپنا گھر بنا چکا تھا اور جو لازوال روحانی اثر اُس نے سواحل پر قایم کر دیا وہ دراصل نامور محترم رامچندر جی کی بھلائی ہوئی تعلیم کو پھر سے فرزندان ہند کے قلوب میں تازہ کرنے والا تھا۔ ابن بطوطہ جس نے اس فتح دکن کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سواحل ہند کی سیاحت کی تھی ان سواحل کو اس اسلامی زبردست ہمہ گیر اثر سے معمور پاتا ہے جو کئی صدی پیشتر سے سواحل ہند سے لیکر چین تک قایم ہو چکا تھا اور جس کے سامنے اس فوج کشی کا اثر ایک پانی کے بلبلہ سے زیادہ نہیں۔

کارومنڈل

یہاں سے کافور معبر (کارومنڈل) کی طرف پلٹا جہاں دو راجہ چھوٹے اور پانڈے علیحدہ

علیحدہ راج کر رہے تھے اور انکو بھی مغلوب کیا۔ غرض اس مہم سے استقدر پیش کش کافور نے دہلی کے محل ہزار ستون (کوشک سیری) میں علاءالدین کے روبرو گزرانی جو فتح دہلی کے بعد سے اس وقت تک کبھی کسی شاہ دہلی کے روبرو پیش نہیں کیگئی تھی۔

کافور کا چوتھا حملہ ۱۲ا۷ھ سوسائٹی کے مزمن خودپرستی اور ہوسناکی کی بدولت کافور بھی علاءالدین کی طرح خضر خاں ولی عہد سلطنت اور اُسکی ماں کے اقتدار سے ڈرتا تھا اور چاہتا تھا کہ موقع پاکر دربار سے دور نکل جائے۔ چنانچہ جب رام دیو کے بیٹے نے علائی اعلیٰ اقتدار سے سرتابی کی تو وہ خود درخواست کرکے دیوگیر آگیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے باغی راجہ کو قتل کرکے مرہٹواڑہ کے اکثر علاقوں کو گلبرگہ، مدگل، رائچور تک نیز بعض علاقہ ہائے تلنگانہ وکرناٹک کو شامل کرکے براہ راست علائی سلطنت کا ایک اہم صوبہ بنادیا جس کا صدر مقام دیوگیر تھا اور جس کا وہ پہلا صوبہ دار تھا۔ یہ اسلام کی ہمہ گیری اور نبی عربی علیہ السلام کی مبارک تعلیم مساوات ہے جسکی بدولت ایک مجہول النسب خواجہ سرا بھی اس قابل بن سکا کہ وہ دکن میں سب سے پہلا مسلم صوبہ دار بنکر اسلامی سلطنت کے زیر سایہ شیرازۂ انتظام قایم کرے جو مدتوں سے یہاں شکستہ ہو رہا تھا۔

علاءالدین اور کافور کی موت اب وہ وقت آرہا تھا کہ سنتہ اللہ علاءالدین کو جلال الدین کے قتل کا بدلہ دے۔ علاءالدین مرض استسقا میں مبتلا ہوا اور اس نے کافور اور الپ خاں صوبہ دار گجرات دونوں کو اپنے پاس دہلی میں طلب کیا۔ اس غرض سے کہ کسی کمسن شاہزادے کو برائے نام بادشاہ بناکر خود حکومت کے مزے لوٹے کافور نے علاءالدین کو ولی عہد خضر خاں اور دوسرے شاہزادوں سے بدظن کردیا۔ چنانچہ اُسکی فریب آمیز باتوں سے دھوکہ کھاکر ترکوں کے سلطان سلیمان قانونی یا زار پیٹر سے ایک درجہ کم جنھوں نے اپنی پیاری اولاد کو قتل کردینے میں کمی نہیں کی علاءالدین نے ولی عہد اور دوسرے شاہزادوں کو قلعہ گوالیار میں محبوس کرادیا۔ الپ خاں جیسا نامور سپہ سالار (جو ولی عہد کا ماموں)

اور اس کا بھائی نظام الدین قتل کر دئے گئے۔ اس رکاکت کی بدولت بدنظمی پیدا ہونی شروع ہو گئی چنانچہ دکن میں بھی رام دیو کے داماد ہرپال دیو نے اکثر تھانے اٹھا دے کہ اس اثناء میں ۶ شوال ۷۱۶ھ کو اکیس سال کی عجیب و غریب پرسطوت سلطنت کے بعد یہ ناموہ سپرد گیا امراء دنیا سے چل بسا اور کہا جاتا ہے کہ کافور نے اسکو زہر دیدیا۔[۱] کافور نے جو اس وقت سیاہ و سفید کا مختار بن رہا تھا ایک پانچ چھ سال کے شاہزادے کو تخت پر بٹھا کر اور ولی عہد وغیرہ کو اندھا کر کے خود سلطنت شروع کی۔ کافور نے مہماتِ دکن میں جو کچھ شہرت حاصل کی تھی وہ دراصل علاء الدین کی عجیب و غریب نکتہ رسا قابلیت کے زیر اثر تھی اور اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ علاء الدین کے جہلم کے اندر اندر ہی ۳۵ روز کے بعد وہ محلسرائے شاہی کی فوج محافظ کے دو جوانوں کے ہاتھ سے مار ڈالا گیا اور اسکی تمام بوالہوسی سپرد خاک ہو گئی۔

اسی سے دونوں کی قابلیتوں اور اوصاف کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ اگر علاء الدین نہ ہوتا تو کافور سے دنیا کو خبر بھی نہ ہوتی۔ جو کچھ کافور نے کیا وہ علاء الدین جیسے عالی دماغ، بیدار مغز کی ہمہ گیر نگرانی اور اصلی کارفرمائی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے فتوحاتِ دکن کا اصلی کریڈٹ علاء الدین ہی کے لئے محفوظ ہے۔ ضیاء برنی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے "عجب بختے و اقبالے نہ باشد کہ سلطان علاء الدین درون چہار دیوار کوشک خود نشستہ بود و غلامے مجبوبے ناقصے گوش پارہ در بازار با گشتہ اقلیم ہا و دیار ہا فتح کند"۔

قطب الدین کا زمانہ قطب الدین جو اب اپنی خوش قسمتی سے بادشاہ ہوا وہ غیر معمولی دل و دماغ نہ رکھتا تھا جسکی ضرورت شخصی سلطنتوں کے حسنِ انتظام کیلئے لابد ہے۔ بہرحال اس نے اپنے جلوس کے ساتھ دیوگیر کا رخ کیا کیونکہ ہرپال دیو نے دیگر دکھنی راجاؤں کی مدد سے پھر کچھ اپنی حکومت کا نقشہ جمایا تھا اور شاہی طازم جابجا سے ہٹا دئے۔ دیوگیر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ دیوگیر صوبہ دکن کا صدر مقام تھا۔ سن شاہی فوج کے آتے ہی باغیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ہرپال دیو کا خاتمہ ہو گیا۔ اب دکن میں بھی امراء کو جاگیریں

---

[۱] فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۳۶۷

دی گئیں۔ اپنے نامور عالی دماغ باپ کی بے غور وفکر تقلید میں اپنے گجراتی النسل خسرو خاں کو جسے اس نے بوالہوسی سے کافور کی جگہ دی تھی "چتر" اور "دور باش" کے لوازم کے ساتھ معبر (کارو منڈل) بھیج کر خود دہلی واپس چلا گیا۔ فوج کی آمد آمد سن کر راجے محفوظ مقاموں میں چلے گئے تھے لہذا کوئی بھاری دولت ہاتھ نہ لگی۔ البتہ اس خیال سے اسلامی فوج تعرض نہ کریگی ایک نہایت دولتمند تاجر خواجہ تقی[1] نام وہاں رہ گیا تھا لیکن خسرو نے اس کو مروا ڈالا اور اسکی دولت ضبط کر کے اپنی کارگزاری کے ثبوت میں قطب الدین کے روبرو پیش کی۔ معبر سے خسرو تلنگانہ گیا۔ وہاں کے راجہ سے پیش کش حاصل کر کے کتلی پہنچا جہاں "چھ درم" کا الماس اس کے ہاتھ لگا۔ پھر وہ معبر چلا گیا اور چاہتا تھا کہ خود مختار بنجائے لیکن امرائے اسٹاف نے اسکی بات نہ مانی۔ مجبوراً معبر کا مفتوحہ علاقہ معتبر امراء کے سپرد کر کے وہ دہلی واپس چلا گیا۔ جہاں اس بد باطن نے اس ضعیف الرائے بوالہوس آقا کی ۴ سال کی حکومت کے بعد جان ہی لیکر چھوڑی۔ یہ وہ آقا تھا کہ جس کی گردن پر چار بھائیوں کے خونِ ناحق کا مظلمہ سوار تھا۔ بالآخر خود تختِ دہلی پر قدم رکھا[2]۔

حسب تصریح ضیا برنی جس طرح بلبن کے ناخلف جانشین کیقباد سے جلال الدین خلجی نے عصائے حکومت لے لیا تھا اسی طرح اب پھر ایک اور نیک نفس پاک باطن ترکی بہادر سپہ سالار غازی غیاث الدین تغلق صوبہ دار پنجاب نے جس نے اپنی ذاتی بہادری سے بتدریج سپہ سالاری کے درجہ تک ترقی پائی تھی اور غیر مسلم مغلوں سے انتیس بار لڑائی کر کے ان کی یورشوں کا دروازہ بند اور اسطرح غازی

---

[1] ہم لکھ آئے ہیں کہ کل سواحل ہند پر اس وقت عرب ہی تجارت کے مالک تھے۔ تاریخ "وصاف" میں مدرا کے راجہ کا نام سندر پانڈے اور وزیر کا نام تقی الدین عبدالرحمن لکھا ہے وہی خواجہ تقی معلوم ہوتا ہے۔

[2] قطب الدین کے زمانہ میں تھانہ (بمبئی کے قریب) جو اس وقت اس علاقہ کی حکومت کا صدر مقام تھا اسلامی عملداری میں شامل ہوا جس پر سب سے پہلے حضرت عمر کے عہد خلافت میں فوج کشی ہوئی تھی۔ عجائب الاسفار صفحہ ۱۶۷

کا خطاب رائے عامہ سے حاصل کیا تھا۔ سنہ ۱۳۲۰ء میں خود امرائے سلطنت کی پرزور خواہش کی بنا پر باتفاق آراء اس تخت دہلی پر قدم رکھا جو اسکی مبارکباد کیلئے چشم براہ تھا[1]

تخت کی تبدیلی اصول قابلیت کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ ایک عالی دماغ حکومت کیلئے منتخب کیا جاتا اور سوسائٹی کی عام رفتار کے لحاظ سے اسکی اولاد مستحق تخت قرار پاتی لیکن جب جانشین نااہل ہوتے ناگزیر تبدیلی شاہ عمل میں آتی۔ اس انقلاب شاہ سے عام اصول انتظام مملکت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ جب مستحق تخت حکمراں ہوتے تو نظم مملکت کی کل ٹھیک چلنے لگتی۔ تمدنی بہار آتی۔ جب جانشین نااہل ہوتے تو کل بگڑ جاتی اور بالآخر دوسرا بادشاہ خود مطلوب قوم ہو جاتا۔

تلنگانہ پر حملہ سنہ ۱۳۲۱ء | پس پھر علائی رو تازہ ہوگئی۔ رودر دیو نے اس اثناء میں خراج پیش کرنے سے سرتابی کی تھی۔ نیز صوبہ دیوگیر میں بدنظمی پیدا ہوگئی تھی۔ اسکی اصلاح کیلئے غیاث الدین تغلق نے اپنے نامور بیٹے الغ خاں ولی عہد کو جو علائی دور میں نمایاں کام کرچکا تھا، بہت بڑی فوج اور اسی پرانے علائی اسٹاف کے ساتھ دکن بھیجا۔ رودر دیو نے قلعہ ورنگل کی فصیل و برج اس عرصہ میں درست کر لئے تھے۔ غرض ورنگل کے حصار گلی کا محاصرہ کیا گیا جس میں مغربی[2] اور عزارہ کا استعمال کیا گیا۔ قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے چنانچہ رودر دیو نے مصالحت کی طرح ڈالی جسطرح کہ علاء الدین کے زمانے میں۔ لیکن الغ خان نے اسکو منظور نہ کیا۔ اس اثناء میں جب ڈاک چند روز کے لئے بند ہوگیا تو لشکر میں بادشاہ کی موت کی افواہیں اڑنے لگیں۔ بیماری بھی پھیل گئی۔ چند امراء علیحدہ ہوگئے۔ محصورین موقع دیکھ کر باہر نکلے اور حملہ کر دیا الغ خاں

---

[1] تغلق کے متعلق مولوی محمد حسین صاحب کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اصل میں ترک قوم سے تھا مگر ہندی اسیل اسمیں تھا۔ صفحہ ۸۲ عجائب الاسفار۔ [2] مغربی کے متعلق نوٹ ورنگل کے پہلے محاصرہ کے ضمن میں لکھ چکا ہوں۔ عزارہ دراصل عرادہ معلوم ہوتا ہے جو فارسی لٹریچر میں بکثرت مستعمل ہے اور جس سے چھوٹی منجنیق مراد ہوتی ہے جسکے ذریعہ سے قلعہ پر پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ ابن بطوطہ نے جو ارعادہ لکھا ہے اس سے بھی مراد عرادہ ہے۔ عجائب الاسفار صفحہ ۱۴۱۔

بھاگ کر دیوگیر چلا آیا۔ علیحدہ ہو جانے والے امراء کو غیاث الدین تغلق جیسے نیک نفس نے خوفناک طریقہ سے موت کی سزائیں دیں۔ چار مہینے کے بعد غیاث الدین نے پھر مزید تیاری کے ساتھ دوبارہ محمد تغلق کو تلافی مافات کیلئے روانہ کیا۔ اب کے بار بیدر کو فتح کرکے ورنگل کا محاصرہ کیا گیا۔ چنانچہ وہ فتح ہو گیا اور اُسکا اسلامی نام سلطان پور رکھا گیا۔ رودر دیو مع اپنے خاندان، خزانہ و فیل خانہ کے خواجہ حاجی کی معیت میں دہلی بھیجا گیا۔ خواجہ حاجی فتوحاتِ دکن کا اصلی اڈمنسٹریٹر تھا۔ الغ خاں ورنگل سے حاجی نگر گیا۔ مولوی بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ "چند روز کے بعد اسکو (رودر دیو) ورنگل آنے کی اجازت مل گئی اور وہ مرتے دم تک بادشاہ کا مطیع و فرمانبردار رہا۔ ۱۳۲۵ء ۷۲۵ھ میں وہ مر گیا[1]

محمد تغلق شاہ دہلی (۷۲۵ھ) اور دیوگیر بجائے دہلی دار السلطنۃ ہند

غازی تغلق کے اپنے ولی عہد کے نو تعمیر محل کے نیچے دب کر مر جانے کے بعد الغ خاں نے بلا کسی منازعت کے محمد تغلق کے لقب سے تختِ دہلی پر قدم رکھا۔ کرناٹک کا بعض حصہ سرکاری ہو گیا تھا اور بعض میں باجگزار راجہ بحال رکھے گئے۔

جس وقت محمد تغلق نے تختِ دہلی پر قدم رکھا ہے تو اس وقت دہلی کا فرمان پشاور سے لے کر راس کماری تک نافذ تھا۔

ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی اس وسعت نے محمد تغلق کو جس نے دیوگیر اور ورنگل بچشم خود دیکھے تھے، یہ سوجھایا کہ دہلی کا پایہ تخت رہنا اسی وقت تک موزوں تھا جب تک کہ شمالی ہند میں اسلامی عملداری تھی۔ اب جبکہ جنوبی ہند بھی اسلامی عملداری میں داخل ہو گیا تو دہلی کے عوض دیوگیر بنام دولت آباد دار السلطنت بننے کے قابل ہے جو تقریباً وسط ہند میں[2] ہے۔ اس خیال کی تحریک اس طرح ہوئی

---

[1] تاریخ بیجانگر صفحہ ۲۰۔ [2] محمد تغلق کے سامنے ہی شیرازہ حکومت منتشر ہو گیا۔ آئندہ چل کر دوسری بار جب پھر اسلامی مغلیہ امپائر کے حدود بھی اسیقدر وسیع ہو گئے تو یہی ماجرا نظر آتا ہے کہ عالمگیر بھی سنہ ۱۰۹۰ھ اورنگ آباد میں عمر بسر (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کہ بہاء الدین گستاسپ (محمد تغلق کے بھانجے) نے جو ساغر (ساگر) اور دولت آباد کا صوبہ دار تھا محمد تغلق کی ماتحتی ناپسند کرکے خود مختاری کا جھنڈا بلند کردیا۔ اور جب شاہی فوج کو بمقام دیوگیر دو دفعہ شکست دینے کے بعد بالآخر ناکام رہا اور کنبلیہ واقع کرناٹک کے راجہ کے پاس پناہ لی تو محمد تغلق بذات خود دیوگیر آیا۔ کنبلیہ کا راج اس مقام پر تھا جہاں اسکے قریب ہی زمانہ میں بیجانگر کا نیا راج قایم ہوا۔[۵] گستاسپ نے ہندو راجہ کے پاس جو پناہ لی وہ تاریخ ہند میں نئی بات نہیں تھی پیشتر حجاج بن یوسف نیز منصور کے زمانہ میں عربوں حتیٰ کہ سادات نے بھی عرب و عراق سے بھاگ کر ہندو راجاؤں کے پاس پناہ لی تھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔

بہر حال کنبلیہ کا راجہ گرفتار ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ مع اقربا چتا میں جل گیا۔ لیکن ابن بطوطہ اسکی اولاد کے مسلمان ہوجانے کا حال لکھتا ہے اور تین بیٹوں کے نام بھی بتائے ہیں جن سے اُسکی دہلی میں ملاقات تھی۔ اور جب گستاسپ وہاں سے بھاگ کر بلال دیو (راجہ میسور) کے پاس گیا تو اُس نے محمد تغلق کے ڈر سے اس کو گرفتار کرکے بھیجدیا۔ گستاسپ کا پوست چھیلا گیا۔ غرض محمد تغلق نے دیوگیر کو دولت آباد کے نام سے دارالسلطنت قرار دیدیا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے کثیر رقم صرف کی۔ دہلی سے دولت آباد تک نہایت عمدہ سڑک تیار ہوئی۔ دو رویہ درخت، ہر منزل پر سرائے۔ ابن بطوطہ جس نے اس سڑک پر دہلی سے دولت آباد کا سفر کیا، لکھتا ہے کہ "دولت آباد دہلی سے چالیس منزل ہے۔ تمام راستہ پر یکساں بید مجنوں اور قسم قسم کے درخت دو رویہ لگے ہوئے ہیں۔ چلنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ گویا باغ کے درمیان چلا جارہا ہے۔ ہر ایک کوس میں تین چوکیاں ڈاک کے ہرکاروں کی تھیں۔ ہر چوکی پر ہر چیز جس کی مسافر کو ضرورت ہوتی ہے ملتی ہے۔ گویا وہ بازار میں جارہا ہے۔ اسی طرح یہ سڑک تلنگانہ

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کردیتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد تغلق کی رائے محض ابلہانہ نہ تھی۔ ایک حد تک اس میں واقعیت کا پہلو تھا۔ لیکن دارالسلطنت سے اہم چیز خود بادشاہ کا کیرکٹر ہے۔ [۵] عجائب الاسفار صفحہ ۱۵۶

اور مصر کے ملک تک چلی گئی ہے[۵۱]"

دولت آباد نئی نئی عمارتوں، باغات، حوضوں کی وجہ سے ایک نیا اسلامی شہر بقول ابن بطوطہ "دہلی ثانی" بن گیا۔ حسب تحریر لچھمی نارائن شفیق (عہد آصفی) ایلورہ تک باغات کا سلسلہ تھا۔ چند ہی سال کے بعد پھر دہلی آباد ہوئی اور دولت آباد تخت گاہ نہ رہا۔ بارہ سال دولت آباد پایہ تخت رہا تھا۔

فوجیں کس کام پر لگائی جائیں؟ محمد غوری نے جو لہر پنجاب سے دوڑائی شروع کی تھی اس کو علاء الدین خلجی نے راس کماری تک پہنچا دیا تھا اور جو کچھ کمی رہ گئی وہ اب پوری ہو چکی تھی۔ ربع صدی کے اندر اندر جنوبی ہند بھی شمالی ہند کے ساتھ اسلامی سلطنت میں شریک تھا۔ اب پھر وہی سوال درپیش تھا کہ فوجیں کس کام میں لگائی جائیں؟ ہندوستان میں کوئی کام باقی نہ رہا تھا۔ غیر مسلم مغلوں کی حملہ آوری بھی نابود ہو چکی تھی۔ بجز اسکے چارہ نہ تھا کہ ہندوستان سے باہر پیش قدمی ہو۔ حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے لئے جو راستہ تجویز کیا تھا اب اسکی نوبت آئی۔ چنانچہ براہ تبت چین کی مہم آغاز کی گئی۔ لیکن یہ شاندار مہم ناتجربہ کاری کی وجہ سے بالکلیہ ناکام رہی۔ ایک لاکھ کی فوج کا غارت ہونا معمولی واقعہ نہ تھا۔ اور اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت اسلامی ہند کا شیرازہ بکھر گیا اور بجائے کسی کمزور جانشین کے وقت میں ہونیکے خود اسکی زندگی میں ہی خود مختار فرماں روا قایم ہو گئے جسکی بڑی وجہ حسب تصریح ضیاء برنی اسکی سوء تدبیری اور ناروا سخت گیری تھی۔ ایک خود مختار بادشاہ کی سوء تدبیری

---

[۵۱] عجائب الاسفار صفحہ ۲۰۳۔ ابن بطوطہ نے جو حالت درختوں کی بیان کی ہے اسکے لحاظ سے مجھے یہ قیاس کرنے میں تامل نہیں ہے کہ سڑکوں کی تعمیر بھی علاء الدین کا کارنامہ ہے جس طرح اس کے اور کارنامے مابعد اشخاص کی طرف منسوب ہو گئے ہیں اسطرح یہ کارنامہ بھی دوسرے کی طرف منسوب ہو گیا۔ ابن بطوطہ نے اس سڑک کا ذکر قطب الدین خلجی کے سفر دولت آباد کے ضمن میں کیا ہے جس طور سے اس نے لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ سڑک قطب الدین کے وقت میں ہی موجود تھی۔ اگر یہ کارنامہ خاص محمد تغلق کا ہوتا تو بوجہ قرب عہد وہ ضرور صراحت سے لکھتا۔

کے جو نتائج ہوتے ہیں وہ فوراً پیدا ہو گئے۔ بنگالہ تو مہم چین کے پیشتر ہی تخت دہلی کے اقتدار سے خارج ہو چکا تھا۔ اسی باعث مہم چین کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ناموزوں راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ اب مہم چین کی ناکامی کے بعد مسلسل خود مختاریوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ معبر (کارومنڈل یا صوبہ مدراس) کا صوبہ دار سید جلال الدین احسن[1] خود مختار بن گیا۔ اُسکے مطیع کرنیکے لئے خود بادشاہ نے معبر کا رخ کیا۔ ورنگل تک پہونچنے کے بعد وہاں سخت وبا پھیل گئی جس میں خود بادشاہ سخت بیمار ہو گیا اور مجبوراً چند امرا کو وہاں چھوڑ کر اُسے واپس آنا پڑا۔ اس طرح معبر خود مختار ہو گیا۔ اور مدرہ واقع جنوبی ہند میں اسلامی ریاست مستقلاً قایم ہو گئی مرہٹواڑی اور تلنگانہ کے دو صوبوں میں سے مرہٹواڑی کا صوبہ دار قتلغ خاں بادشاہ کا استاد مقرر ہوا اور تلنگانے کا نصرت خاں۔ اس نے اس صوبہ کا ایک کروڑ ٹنکہ[2] پر سہ سالہ تعہد لیا۔ تعہدداری طریقہ کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اس تعہدداری طریقہ کی ضرورت مالی خراب حالت کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ محمد تغلق کی مسرفانہ داد و دہش، اس وقت کی اسلامی دنیا کا سلطان بننے کی ہوس میں شاندار تجاویز، تبدیل دارالسلطنت، جہاں گیری خزانہ سے بل من مزید کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ کوئی نیا ملک فتح نہیں ہوا کہ جس سے جدید آمدنی کی صورت پیدا ہوتی۔ قدرت کی طرف سے بار بار قحط کا دورہ ہوا۔ غرض محمد تغلق نے ہر جگہ مزید محاصل کا مطالبہ شروع کیا۔ چنانچہ مرہٹواڑی میں بھی خود سرکاری محصل مقرر کئے[3]

نصرت خاں نے بڑی جرات کر کے اسقدر رقم کا تعہد لے لیا تھا۔ جس کا بلحاظ حالات حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود کمال کفایت شعاری اور انتظام کے تہائی چوتھائی رقم تعہد بھی وہ پیش نہ کر سکا اور چونکہ نتیجہ معلوم تھا لہذا خود مختار بن گیا۔ اُسکی اصلاح کیلئے قتلغ خاں بھیجا گیا جس نے اسکو گرفتار کر کے بادشاہ

---

[1] یہ سادات کیتھل سے تھا جنھیں ضیاء برنی کے مطبوعہ نسخہ میں "سادات نوہسنہ" لکھا ہے لیکن فرشتہ میں "سادات نوابتہ" درج ہے۔ [2] ٹنکہ کے متعلق مولوی محمد حسین نے تفصیلی تحقیقات کی ہے۔ حاصل یہ کہ "روپیہ" کا استعمال شیر شاہ کے زمانہ سے ہے اس سے پہلے ٹنکہ مروج تھا۔ کم و بیش اُسکو اس زمانہ کا روپیہ کہنا چاہئے۔ [3] ضیاء برنی صفحہ ۴۸۱

کے پاس بھیجدیا۔ لیکن انتظام کی کل بگڑ گئی تھی۔ ایک فتنہ دبتا تھا تو دوسرا سر اٹھاتا۔ علی شاہ (حسن بہمنی بانی خاندان بہمنی) کا بڑا بھائی جو قلتغ خاں کا ایک ماتحت امیر صدہ تھا۔ گلبرگہ و بیدر پر قبضہ جما کر خود سر ہو گیا۔ اسکی اصلاح کیلئے بھی قلتغ خاں بھیجا گیا۔ اُس نے اس کو بھی گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ چنانچہ وہ اپنے وطن غور میں جلا وطن کر دیا گیا۔ واپس آنیکی کوشش کرتے ہوئے مار ڈالا گیا۔

قلتغ خاں | یہ قلتغ خاں صوبہ دار دکن اسلامی تاریخ دکن میں ممتاز درجہ رکھتا ہے جس طرح ضیا برنی اُس کے اوصاف کا مدح سرا ہے ابن بطوطہ بھی اُسکی تصدیق کرتا ہے۔ وہ پابندی عہد میں مشہور تھا اور لوگ اُسکے قول پر بھروسہ کرتے تھے۔ اس کے رفاہ عام کے کام یادگار ہیں۔ دولت آباد کا "حوض قتلو" اسی کی یادگار ہے۔" در عدالت و حسن سلوک عدیل و نظیر نداشت"۔ دکن کے چار صوبہ اول اسی نے قرار دئے۔ محمد تغلق کے شوریدہ من مزید نے اب کل دکن کا ٹھیکہ سات کروڑ ٹنکہ پر دینا چاہا۔ چنانچہ اس کام کے لئے نئے عہدہ دار بھیجے گئے۔ قلتغ خاں اِس بنا پر کہ اس نے محاصل گھٹا دئے واپس بلا لیا گیا۔ اُسکی نیک نیتی کا اندازہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جاتے جاتے بھی اپنے بھائی نظام الدین کو جو اسکی جگہ منصرم مقرر ہوا تھا "حوض قتلو" کی تکمیل کی ہدایت کرتا گیا جو اُس وقت زیر تعمیر تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ" ایں معنی عقلا را مقرر بود کہ خلق دیوگیر کہ برقرار ماندہ است بواسطہ مسلمانی و دیانت و عدل و احسان و مہر و شفقت قلتغ خاں ماندہ است آنجائیاں از ہندو و مسلماں از استماع بسیاری سیاست بادشاہی متنفر گشتند"۔

دکن میں خود مختاری کی لہر | محمد تغلق کو بجز زیادہ ستانی اور سخت گیری کے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ اُس نے دکن کے تمام امرائے صدہ کے قتل کے احکام جاری کئے۔ چنانچہ ایک ہی روز میں اسّی امرائے صدہ قتل کئے گئے۔ اس حماقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ باقی امراء کو حفاظت خود اختیاری کا سلسلہ آغاز کرنا پڑا چنانچہ اُن امراء نے جن کو ابتدائی دور کے نئے جاگیردار کہنا چاہئے۔ مخ افغاں برادر ملک مل افغاں کو

باتفاق بہ مصالحِ حفاظت اپنا رئیس بہ لقب ناصر الدین مقرر کیا جو گو ابنیہ دیرینہ سال امیر تھا۔ نورالدین ہروی وزیر اور حسن شاہ بہ خطاب ظفر خاں بانی خاندان بہمنی امیر الامرا یا سپہ سالار غیاث الدین تغلق کو تخت دلی اسی طرح امرائے دربار کے اتفاق سے ہی ملا تھا۔ اور محمد تغلق کی سوتدبیری اور سخت گیری سے امرائے دکن کو بھی اسکے سوا چارہ نہ تھا۔ یہ خبر سن کر محمد تغلق بھڑوچ سے جہاں وہ اس علاقہ کی بغاوت کا انتظام کر رہا تھا، اپنی زندگی میں آخری دفعہ دولت آباد پہونچا۔ شاہی فوج سے مقابلہ دشوار تھا۔ لہذا حسن شاہ کی رائے کے مطابق مخ افغاں دہارہ گڑھ کے قلعہ میں چلا گیا۔ حسن وغیرہ اپنی اپنی جاگیروں میں چلے گئے بادشاہ نے عماد الملک اپنے داماد کو گلبرگہ بھیجا کہ وہاں حسن وغیرہ کو گرفتار کرے۔ ابھی بادشاہ یہاں مصروف انتظام ہی تھے کہ گجرات سے طغا کے بغاوت کی خبر پہونچی۔ لہذا اس نے پھر بھڑوچ کا قصد کیا۔ اس کے جاتے ہی حسن نے عماد الملک پر حملہ کر کے اسکو مار ڈالا۔ دولت آباد میں جو شاہی نئے افسر تھے وہ خود بھاگ کر واپس چلے گئے۔ حسن اور مخ وغیرہ سب امرائے دکن اب پھر دولت آباد میں جمع ہوئے۔ اس عرض مدت میں حسن ظفر خاں ہی اصلی لیڈر رہا تھا۔ مخ بجز سینیارٹی کے وہ عملی قابلیت نہیں رکھتا تھا جو ظفر خاں کی ثابت ہوئی تھی۔ سب امرا حسن کے ہی گرویدہ تھے۔ لامحالہ ناصر الدین نے خود استعفا دیدیا اور اب حسن کا انتخاب ریاست کیلئے عمل میں آیا۔ اس نے علاء الدین کے لقب سے علاء الدین اول کی یاد تازہ کر دی اور سلطنت بہمنی کی بنا ڈالی۔ لیکن اس جدید اسلامی ریاست کا اقتدار ابتداءً صرف مرہٹواڑی اور کسیقدر کنڑی علاقہ تک محدود تھا۔ کیونکہ جنوبی ہند میں تو ایک مستقل ریاست جلال الدین احسن نے قایم کر لی تھی اور دونوں کے بیچ میں ایک نیا راج بیجانگر کا قایم ہو گیا تھا اور ورنگل میں بھی سابقہ حالت عود کر آئی تھی۔

ورنگل اور بیجانگر | شہاب الدین غوری بلکہ محمود غزنوی بلکہ محمد بن قاسم کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک سندھ، پنجاب، شمالی ہند میں ہر جگہ یہ ایک عام کلیہ ہے کہ نئی حکومت کے بعد پھر پرانا نقشہ کہیں نظر

نہیں آتا لیکن اس عام کلیہ کے برخلاف ورنگل اور بیجانگر میں سابقہ نقشہ کا قیام بہ ظاہر تعجب خیز معلوم ہوگا۔ وہی مشیتِ ایزدی جس نے محمد بن قاسم کو پیشقدمی سے روکدیا تھا اسکے اسباب مہیا کرنیوالی تھی۔

رام دیو راجہ مرہٹواڑی کے ساتھ جو سلوک علاءالدین خلجی نے کیا تھا یعنی بطور باجگزار حکومت کے اس کا بحال رکھنا۔ وہی سلوک رودر دیو راجہ ورنگل کے ساتھ غیاث الدین تغلق نے کیا تھا۔ رودر دیو کے بعد اس کا بیٹا کشنا نایک جانشین ہوا جو حسب تحریر فرشتہ نواح ورنگل میں ہی رہتا تھا جس طرح رام دیو کے بعد اسکے جانشینوں نے آزادی کی ہوس کی تھی اسی طرح یہاں بھی ہوا۔ لیکن اول الذکر کوشش ایسے زمانہ میں ہوئی کہ جب تقدیر ناساعد تھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ راج ہی معدوم ہوگیا۔ لیکن یہاں ورنگل کی کوشش کو زمانہ مساعد ہوا۔

ضیاء برنی لکھتا ہے۔" در ورنگل فتنہ ہنود برخاست و کنھیا نایک دراں دیار زور آورد و ملک مقبول نائب وزیر از ورنگل راہ شہر (دہلی) گرفت و بسلامت در دہلی رسید۔ و ورنگل را ہندواں فرو گرفتند و آں دیار کلی از دست رفت و ہم دراں ایام شخصے از اقرباء کنھیا (کشنا) کہ سلطان محمد در کنبلیہ فرستادہ بود۔ آں بدبخت از اسلام بگشت و مرتد گشت و بعضی ورزید و عرصہ کنبلیہ ہم از دست رفت و بدست ہندواں افتاد و ہماں مرتداں را فرو گرفت و بجز دیوگیر و گجرات در ضبط نماند۔ در ہر طرفے تخلل و تشتت زاد۔"[1]

اس عبارت میں تین اشخاص کا نام آیا ہے۔ کشنا نائک، ملک مقبول، حاکم کنبلیہ۔ ان میں مقبول کی نسبت عجائب الاسفار میں درج ہے کہ" یہ شخص دراصل تلنگانے کا رہنے والا تھا اور وہاں کے راجہ کا کوئی بڑا اہلکار تھا۔ شمس سراج عفیف نے لکھا ہے کہ مسلمان ہونے سے پہلے اُس کا نام کنٹو تھا۔ جب وہ رائے تلنگانہ کے ساتھ دہلی آیا تو مسلمان ہوگیا۔ بادشاہ نے مقبول اس کا نام رکھا۔ یہ شخص فارسی پڑھا ہوا نہیں تھا لیکن بہت ہوشیار اور منتظم آدمی تھا۔"[2] الغرض ملک مقبول مسلمان ہی رہا اور

---

[1] ضیاء برنی صفحہ ۴۸۴ [2] صفحہ ۱۹۴

گجرات وغیرہ کے مہموں میں بھی اُس کا نام آیا ہے

(۲) کشنا نائک کے متعلق فرشتہ نے صراحت کی ہے کہ اُس نے میسور کے راجہ سے مدد حاصل کی اور اسی کی امدادی فوج سے وہ ورنگل پر پھر قبضہ حاصل کرسکا۔ ضیا برنی نے تصریح نہیں کی کہ کشنا نائک بھی مسلمان ہوگیا تھا۔ مولوی بشیرالدین احمد لکھتے ہیں کہ "کشنا مسلمان ہوگیا تھا۔ لیکن آگے چل کر اسلام سے منحرف ہوگیا"[۱] اگرچہ کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے لیکن کسی ماخذ سے ہی لکھا گیا ہوگا۔ بہرصورت کشنا نائک نے ورنگل راج پھر قایم کردیا۔

(۳) اس تیسرے شخص کی تحقیق کرنی ہے جس کا ضیا برنی نے اقربا کشنا نائک سے اور اس کا حاکم کنبیلہ بنایا جانا اور پھر اُس کے "مرتد" ہونیکی تصریح کی ہے۔ ضیا برنی نے اس کا کوئی نام نہیں لکھا لیکن یہ مسلم ہے کہ بیجانگر راج کا بانی "ہری ہر" ہے۔

بیجانگر راج کے قیام کی جو تاریخ افسانوں کی تحلیل و تحقیقات کے بعد پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ ہری ہر اور اس کا بھائی دونوں "کردیا" ذات سے تعلق رکھتے اور ورنگل کے راجہ کے پاس ملازم تھے۔ ورنگل فتح ہونے کے بعد دونوں بھائی کنبیلہ (اناگندی) چلے آئے اور یہاں وہ ملازم ہوئے اور حسن کارگزاری سے وزیر اور خزانچی کے عہدوں تک پہنچ گئے۔ جب راجہ نے گشتاسپ کو پناہ دی اور اسکے بعد محمد تغلق کا اناگندی پر قبضہ ہوگیا تو دونوں بھائی بھی اُسکے ساتھ دہلی گئے وہاں سے محمد تغلق نے پھر ہری ہر کو صوبہ دار کنبیلہ بناکر بھیجا۔ اس واقعہ کو پرتگالی سیاح "فیونیز" نے بھی لکھا ہے جو بیجانگر میں کشن دیورائے کے زمانہ میں آیا تھا۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر یہ واقعہ زبان زد خلایق ہوگا[۲] اس طرح قدرت نے ہری ہر کے لئے راستہ صاف کردیا تھا۔ چونکہ اس نے اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی پائی تھی اور زمانہ کی رفتار پر بخوبی نظر ڈالی تھی۔ دہلی کی تہذیب تمدن بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی۔ دونوں

---

[۱] تاریخ بیجاپور ضمیمہ ورنگل صفحہ ۵۹۶ [۲] تاریخ بیجانگر صفحہ ۳۴۷

سوسائٹیوں سے اسکو پورا سابقہ پڑ چکا تھا۔ اسلئے یہ امر اُسکے لئے آسان ہوگیا کہ پرانا راج جدید رنگ میں تازہ کرے۔ مسلمان ہوکر پھر اس کا ارتداد بحث طلب ہو لیکن یہ مسلم ہے کہ اُس زمانہ کے عام لوگوں سے اُس کا عقیدہ بالکل مختلف اور وہ توحید کا قایل تھا۔

نواب سرامین جنگ بہادر بالقابہم کا قابل قدر مضمون جو رسالہ ترقی حیدر آباد میں شایع ہوچکا ہے اس میں اچھی طرح بتایا گیا ہے کہ مسئلہ توحید نے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً کیا رنگ بدلے۔ سری شنکر اچاری نے توحید کی تعبیر "وحدۃ الوجود" سے کی (لاموجود اِلّاھو) اس مسئلہ "وحدۃ الوجود" نے بتدریج اہل ہند کو مبدا توحید سے بہت دور کردیا تھا۔ اور جس وقت ہندوستان میں اسلام آیا تو دراصل وید اور سری شنکراچاری کی تعلیم 'نسیاً منسیاً' ہوچکی تھی[۱]۔ اور سری راماچاری نے ہندوستان میں ظہور اسلام کے بعد وحدۃ الوجود کو توحید کی طرف زیادہ مایل کردیا تھا۔ لیکن جس وقت یہ دونوں بھائی میدان سیاست میں آئے ہیں سری مادھواچاری کا ظہور ہوچکا تھا۔ انھوں نے قدیم مسئلہ وحدۃ الوجود کے عوض صاف صاف "وحدہ لاشریک لہ" کی تعلیم جاری کردی تھی۔ دونوں بھائی انہی سری مادھواچاری کے معتقد خاص تھے۔ اور تمام روایات میں ہے کہ انہی کی مدد سے دونوں بھائیوں نے بیجانگر نامناسب موقع پر بسایا تھا۔ (سنہ ۱۲۳۶ء م سنہ ۷۳۶ھ)

بیجانگر راج کی بناء چونکہ زمانہ کے اقتضاء پر رکھی گئی تھی لہذا نظر آتا ہے کہ دن بدن اُس کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور آئندہ عرصہ تک کنڑی اور جنوبی ہند میں اُس کا ڈنکہ بجتا ہے۔ ہری ہر نے سری مادھواچاری کی یادگار میں جسکی بدولت اُسے یہ رتبہ حاصل ہوا تھا ہمپی کا عظیم الشان مندر تعمیر کرایا۔

---

[۱] اس مقام پر کتاب کا وہ حصہ ختم ہوجاتا ہے جس پر مرحوم نے اپنی آخری نظر ڈالی تھی اور اُس کو صاف کرلیا تھا۔ یہاں سے آغاز باب چہارم تک وہ حصہ ہے جس کا مبیضہ افسوس ہے کہ کھو گیا۔ اس کی تفصیل عرض حال میں بیان کی جاچکی ہے۔ محمد غوث۔

تاریخ عالم کا یہ ایک دستور نظر آئے گا کہ جب پرانے خاندانِ حکومت معمولی اسباب فنا کی بدولت مٹنے لگتے ہیں اور ایک نئی حکمراں قوم کا جلوہ نظر آتا ہے تو اس کشمکش کے دور میں پرانی قوموں میں خود رَو تازہ قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح پرانے قدیم حکمراں خاندانوں کی جگہ بیجانگر کے راج نے لی۔ اس راج نے وہ عظمت و سطوت حاصل کرلی جو اُس وقت کے پیشتر عہد قریب کے راجاؤں کو بھی نصیب نہ تھی جو بہت چھوٹے چھوٹے رقبہ میں حکمراں ہوتے تھے۔

۱۳۳۶ء یا سلطنت بہمنی کے باقاعدہ آغاز کے کسیقدر پیشتر ہی بیجانگر کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اور اس نے بہت جلد پرانے حکمراں پانڈے وغیرہ خاندانوں کو جو نیم مردہ حالت میں تھے خواب عدم میں سُلادیا تھا بیجانگر کی مضبوط سلطنت کے حدود نہایت وسیع تھے۔

قدیم حکومتوں سے بیجانگر کے اصول حکومت اور طرز تمدن کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے جدید حملہ آور قوم (مسلم ترک) کے اصول اختیار کرلئے تھے اور اس طرح اس کو ایک نیم مسلمان حکومت کہنا بے جا نہیں ہوسکتا۔

بابِ چہارم

سلطنتِ بہمنی کا دَور

سُلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی

علاء الدین بہمنی، جس کو دکن میں خود مختار اسلامی سلطنت کا بانی ہونا مقدر تھا، علاء الدین خلجی کے مشہور تاریخی سپہ سالار ظفر خاں علائی صوبیدار پنجاب کا بھانجا تھا۔ جبکو علاء الدین خلجی نے اپنے چار یاروں

میں کا ایک یار قرار دیا تھا۔ ماموں کے زیر سایہ غور سے آکر وہ اولاً ملتان میں رہا۔ ظفر خاں کے غیر مسلم مغلوں کی مدافعت میں مارے جانیکے بعد جب غازی تغلق (غیاث الدین تغلق) بلحاظ قابلیت صوبیدار پنجاب مقرر ہوا تو ظفر خاں کا خاندان فلاکت میں آگیا لیکن پھر سنبھل گیا۔

فرشتہ نے اس کے خاندان کی نسبت صراحت سے نہیں لکھا ہے جس سے لوگوں کو شبہ ہو گیا۔ سرکاری تاریخوں اور کتبوں میں اسکو نسلِ شاہ بہمنی ایرانی سے بیان کیا گیا ہے۔ بہر صورت وہ غور کے اچھے خاندان سے تھا اور اُس وقت کی اُس اعلیٰ سوسائٹی میں تربیت پائی تھی جس میں محمود غزنوی اور محمد غوری پیدا ہوئے تھے۔

حسن اور اس کا بڑا بھائی علی دونوں دہلی میں آئے۔ اس حسن کا گنگو منجم کے ذریعہ سے محمد تغلق کے دربار میں پیش ہونا اور ایفاء عہد میں آئندہ گنگو جز و لقب قرار دینا ایک دلکش تاریخی واقعہ ہے جس سے اسلامی وفاداری کی ایک ایسی نظیر ملتی ہے جو بھولی نہ جائیگی۔ قتلغ خاں کے اسٹاف میں یہ دونوں بھائی بھی دکن میں آئے۔ اسمٰعیل مخ اور سیف الدین غوری بھی اسکے رفقاء تھے۔

علی شاہ کی بغاوت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس نے پہلے تعہد دار نصرت خاں کی گرفتاری کے بعد میدان خالی پاکر گلبرگہ کے حاکم بھیرن کو قتل اور پھر وہاں سے بیدر جاکر وہاں کے نائب کو بھی مار ڈالا۔ اور اس طرح گلبرگہ و بیدر اپنے قبضہ میں کر لینے کے بعد علَم خود مختاری بلند کر دیا۔ آخر قتلغ خاں صوبیدار نے علی کو ساتھ قول و قرار کرکے اسکو محمد تغلق کے پاس بھیجدیا اور اس نے اسی پاسِ عہد قتلغ خاں کی وجہ سے صرف اسکو غور میں جلاوطن کرنا کافی سمجھا لیکن پھر وہ ہندوستان کا قصد کرتے ہوئے سندھ میں گرفتار اور مار ڈالا گیا[1]۔ بہر حال اس دار و گیر کے وقت نیک نفس قتلغ خاں نے چھوٹے بھائی حسن کو بحال خود دولت آباد میں باقی رکھا تھا۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا اس کا بیان اوپر آچکا ہے۔ قسمت سے قبا و بادشاہی حسن کے قد پر

---

[1] ابن بطوطہ نے بھی علی شاہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شخص بڑا خوبصورت بہادر اور اچھی خصلت کا آدمی تھا

راست کی گئی تھی۔ چنانچہ ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ م ۳ اگست ۱۳۴۷ء کو دولت آباد کی مسجد قلعہ میں اسکی تخت نشینی کی رسم منجانب قوم ادا کی گئی۔ حضرت شیخ سراج الدین جنیدی (جن کا مزار گلبرگہ میں روضہ شیخ کے نام سے زیارت گاہ خلایق ہے) اس رسم تخت نشینی میں شریک تھے اور انھوں نے ہی اسکے کمر میں تلوار حمایل کی تھی۔ جلوس کے بعد پہلا حکم اس نے یہ دیا کہ اسقدر اشرفی اور روپیہ حضرت برہان الدین غریب قدس سرہ (جن کا مزار پرانوار خلد آباد میں ہے) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا جائے کہ وہ اُسکو حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہٗ کی رُوح پرفتوح پر ایصال ثواب کی غرض سے حسب صوابدید مستحقین میں تقسیم فرمائیں[۱]۔ حضرت کے فیض یابوں میں علاء الدین بہمنی کا بھی داخلہ ہے۔

اس طرح دکن میں مستقل اسلامی حکومت قایم ہوگئی۔ اور محمد تغلق کو اس کے بعد اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ دکن کا رُخ کرے گجرات اور سندھ کے مہموں میں ہی سرگرداں پھرتے ہوئے وہیں ۷۵۲ھ میں ۲۷ سال کی حکومت کے بعد اسقدر لوگوں کی جانیں لینے کے بعد دنیا سے اُٹھ گیا۔

علاء الدین خلجی اور محمد تغلق دونوں کے اوصاف کا فرق اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ایک علاء الدین کوشک سیری میں ہی بیٹھے ہوئے ۲۰ سال تک پشاور سے راس کماری تک شہنشاہی کرتا رہا لیکن محمد تغلق باغیوں کی سرکوبی کے لئے تمام ہندوستان کی خاک چھاننے کے بعد بھی شیرازہ حکومت مجتمع رکھنے میں بالکلیہ ناکام رہا اور اپنی زندگی میں ہی اسکے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھ لئے۔

اسطرح اگرچہ دکن دہلی سے الگ ایک مستقل ریاست کی شکل میں آگیا اور اُس نے بھی مسند خلافت[۲] سے براہ راست تعلقات قایم کئے اور اُس مبدا خلافت سے تعلق ظاہر کرنے کیلئے چتر سفید کی عوض چتر

۱؎ تاریخ محمد عبدالجبار خانصاحب جلد اول صفحہ ۱۰۰۔ ۲؎ ۶۵۶ھ جس زمانہ میں دربار خلافت بغداد میں فنا ہوا تھا اُس سے ذرا پیشتر سلطان صلاح الدین کی اولاد بھی تخت مصر خالی ہوچکا تھا اور اس ترک خاندان کے ترکی غلام خود اس تخت پر متمکن ہوچکے تھے۔ انہی ترک غلاموں نے مغلوں کو عین جالوت پر وہ تاریخی شکست دی تھی جس نے مغلی سیلاب کو روک دیا۔ اس طرح مصر اسوقت (بقیہ بر صفحہ آیندہ)

سپاہ منتخب کیا گیا جو خاص عباسیوں کا رنگ تھا۔ تاہم دربار دہلی کی اعلیٰ حکومت تسلیم کیجاتی اور پیشکش گزرانی جاتی تھی۔ خلیفہ وقت حاکم بامر اللہ نے فیروز شاہ تغلق جانشین محمد تغلق کو سند حکومت ہند دیتے ہوئے شاہان بہمنیہ کے لئے بھی سفارش کردی۔ فیروز شاہ تغلق ایک نہایت نیک نفس، امن پسند، سچا مسلمان بادشاہ تھا۔ لہذا اس کو اس سفارش سے اختلاف کرنیکی ضرورت ہی نہیں ہوئی۔

گلبرگہ پایۂ تخت علاء الدین نے بجائے دولت آباد کے جو اس وقت تک اسلامی صوبہ دکن کا دار الحکومت رہا تھا، گلبرگہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ چونکہ یہ اسکی جاگیر تھی اور عموماً مشرقی بانیان حکومت اپنے لئے علیحدہ پایۂ تخت بلحاظ اپنی ہو خواہ پارٹی کے منتخب کرتے آئے ہیں لہذا یہی وجہ انتخاب معلوم ہوتی ہے۔ مع ہذا دولت آباد اسلئے بھی نئی حکومت کیلئے مناسب نہ تھا کہ وہ دہلی سے قریب اور اس لئے زیادہ خطرہ کا مقام تھا۔ گلبرگہ اس وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے موزوں تھا۔ ورنگل اور بیجانگر کی معاصر حکومتوں کے لحاظ سے بھی یہی مناسب تھا۔

علاء الدین کی شخصیت علاء الدین بہمنی اُن تمام اوصاف سے پوری طرح متصف تھا جو نامور بانیان خاندان پایۂ سلطنت کے ہوتے آئے ہیں۔ عالی دماغ روشن ضمیر، منتظم، مدبر۔ وہ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور علم کی قدر کرتا تھا۔ بکثرت علماء اسکے دربار کی زینت تھے۔ اس نے اپنے شہزادوں کی تعلیم کا بھی عمدہ بندوبست کیا۔ تینوں شہزادوں محمد، محمود، داؤد کی تعلیم زیر نگرانی فضل اللہ آنجو ہوئی تھی جو علامہ تفتازانی

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) اسلام کا امن تھا۔ اور عربوں کی بچی کھچی طاقت مصر میں جمع ہوئی اور عباسی خلیفہ کی مسند قاہرہ میں سجائی گئی۔ لیکن یہ مسند مثل پایہ رو مامرف تبرک کے لحاظ سے تھی اور علاً ان خلفاء کو وظیفہ خوار غلامانِ مصر کہنا چاہئے۔ محمد تغلق نے تبرکاً ایسے ہی خلیفہ سے سند حکومت ہند حاصل کی تھی۔ دکن سے چونکہ سواحل قریب تھے اور دکن کے بندرگاہ عربستان کے دروازہ سمجھے جاتے رہے ہیں لہذا دکن کے مصر سے تعلقات بآسانی قایم تھے (جیسے کہ ہم پہلے بھی بار بار لکھ آئے ہیں) علاء الدین بہمنی نے اہل حرمین کے پاس بکثرت تحفے بھیجے تھے۔ اور انہی کے ذریعہ سے سند خلافت سے سند حاصل کی تھی۔ ۱۲

کا نامور شاگرد تھا۔ بقول مصنف ملحقات طبقاتِ ناصری۔ گنج العلوم بیجاپوری۔ علامہ جزری (مشہور قاری) کا شاگرد گلبرگہ میں آیا جسکی علاء الدین نے نہایت تعظیم کی۔ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے اسکو مقرر کیا۔ قاری موصوف نے بادشاہ کیلئے ایک قرآن شریف ہفت قرأت میں لکھا یعنی جتنے اختلافِ قرأت ہیں وہ سب ایک جگہ معلوم ہو جاتے ہیں۔ سنہری جدولیں یاقوتی روشنی کے بیل بوٹے حاشیوں پر بنائے مولوی عبدالجبار خاں صاحب نے لکھا ہے کہ "مشہور ہے کہ وہ قرآن شریف ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں تھا۔"[1] باغیوں وغیرہ کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ نہایت فراخ مشربی کا تھا۔ اور یہی چیز اسکی سلطنت کی بنیاد مستحکم کرنے والی تھی۔ راجاؤں وغیرہ سے اس کا برتاؤ نہایت خوش آیند تھا۔ کسرس زمیندار کنبای ناراین ریڈی قلعدار مدہول۔ راجہ کو لاس سے اسکی معافی کے واقعات یادگار رہینگے۔ اس نے ناراین ریڈی کے گلے میں اپنے گلے کا مالہ اتار کر ڈالا۔ اس کا قول مشہور ہے کہ " اگر تا بہ زندگی یہ مجھ سے خلاف کرتے جائیں اور پھر معافی مانگتے جائیں تو میں معاف ہی کرتا جاؤنگا۔"[2]

کسی کی جان لینے میں بھی وہ بے حد محتاط تھا۔ تا امکان قتل پر عفو اور جنگ پر صلح کو ترجیح دیتا تھا۔ اسمٰعیل مخ کو شاہی سے استعفاء دینے کے بعد امیر الامرا بنایا گیا تھا۔ آیندہ چل کر جب سیف الدین غوری وکیل السلطنت (مدار المہام) مقرر کیا گیا۔ اور اسکی تعظیم زیادہ کیجانے لگی تو اس نے علاء الدین کے خلاف سازش کی۔ سازش کھل گئی۔ اور بعد تحققات بفتویٰ امیران صدہ اسکو سزائے موت دیگئی (اپنی اپنی قسمت) بااین ہمہ علاء الدین نے اس کے بیٹے کو باپ کی جگہ دی اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو نہیں ستایا۔

باشندگان ملک کے ساتھ جو بے مثل فیاضانہ پالسی برتی اس کی یادگار میں گنگو پنڈت کا نام

---

[1] تاریخ دکن محمد عبدالجبار خانصاحب صفحہ ۲۱۱۔ اسکی نقل مولوی حسین عطاء اللہ صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے نیز خاندان میں اسکے اور بھی منقول عنہ نسخے موجود ہیں۔ [2] تاریخ محمد عبدالجبار خانصاحب صفحہ ۲۰۱۔

اس کا جزو بن گیا ہے۔

انتظام مملکت میں سابق باشندگانِ ملک کو دخل دینے کے ساتھ ہی عام طور پر اُن سے نہایت رواداری برتی۔ کسی برہمن کو نہ قتل کیا نہ ستایا۔ بلکہ انکی عزت کرتا تھا۔ اِن سب اوصاف کے ساتھ عام سوسائٹی اور صدیوں کے مسلسل معاشرت کے برخلاف یہ ایک عجیب وصف نظر آتا ہے کہ ایک ہی بیوی ملکہ جہاں[1] پر قناعت کی۔ کوئی حرم مطلق نہ تھی۔

علاء الدین بہمنی کو بھی محمد تغلق کی طرح جہانگیری کا ولولہ پیدا ہوا۔ ملحقات میں جو مکالمے علاء الدین اور اوسکے دست بازو سیف الدین غوری مدار المہام کے نقل کئے ہیں وہ گویا علاء الدین اور عماد الملک کے مکالموں کی نقل تازہ کرتے ہیں[2]۔ سنہ ۷۵۹ھ میں جب کہ وہ مہم گجرات کے قصد سے نوساری تک پہونچ چکا تھا۔ کیونکہ گجرات بھی اب مستقل حکومت طلب کر رہا تھا۔ علاء الدین کا انتقال ہوگیا۔ ۶۷ سال عمر پائی۔ گیارہ سال حکومت کی۔

محمد شاہ بہمنی | بڑا بیٹا محمد شاہ اس کا سچا اولوالعزم جانشین تھا۔ شیخ سراج الدین جنیدی نے اسکے بھی کمر میں تلوار باندھی اور اپنے ہاتھ سے تخت پر بٹھایا۔ جب ایک منتظم حکومت لایق جانشین کو مل جاسے تو فارورڈ پالسی لازمی ہے اور اسکے اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ورنگل کے راجہ نے بیجا نگر کی امداد سے حملہ کیا جس کا سلسلہ عرصہ تک رہا۔ بالآخر گولکنڈہ بطور سرحد قرار دیا گیا۔ اور اسی صلح کے وقت مشہور تخت فیروزہ بھی ورنگل کے راجہ سے ملا۔ بیجا نگر سے بھی مقابلہ کی نوبت آئی جہاں توپخانہ کا رواج اس وقت ہو چکا تھا۔ اسکی مدافعت کیلئے محمد شاہ نے بھی اسلامی ہندوستان میں سب سے پہلے توپخانہ قایم کیا۔ بقول فرشتہ "فرامین مطاعہ بہ جمیع قلاع و ممالک محروسہ مرسول داشتہ

---

[1] یہ ملکہ بھی جو گویا اپنے زمانہ کی رابعہ تھی اپنے خیراتی کارناموں کے لحاظ سے یادگار زمانہ ہے۔ اس نے حرمین کا سفر کیا تھا جس میں کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار آدمی کا قافلہ ساتھ تھا اور سب کے سب سلامت واپس آئے جو ایک کرامت تھی۔ [2] تاریخ فخر الجبار خان ضمیمہ صفحہ ۱۸۹ تا ۱۹۴

توپ و ضرب زن بسیار طلب کردہ کارخانہ آتش بازی راکہ پیش ازیں در دکن میان مسلمانان شایع بود محل اعتماد ساختہ سرکاری آں را بہ مقرب خان ولد صفدر خان سیستانی کہ از امرا و معتمد بود رجوع فرمود۔ و جمیع رومیاں و فرنگیاں[۱] کہ ملازم آں موکب منصور بودند تابع مقرب خاں شدہ توپ خانہ بزرگ تربیت یافت۔"

انٹر نیشنل اصول بیجانگر والوں نے مدگل فتح کر کے آٹھ سو مسلمانوں کو عورتوں اور بچوں کے بلا امتیاز قتل کر دیا تھا جس پر سلطان محمد نے قتل عام کی قسم کھائی اور اس نے ادھونی وغیرہ ہوتے ہوئے خود بیجانگر کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر صلح ہو گئی۔ صلح کے بعد سفیروں نے عرض کیا کہ کسی مذہب میں بے گناہ کو مجرم کے عوض قتل کرنا جائز نہیں ہے علی الخصوص عورتوں اور بچوں کو۔ محمد شاہ نے بھی اسکو تسلیم کیا اور " اس نے خدا سے عہد کیا کہ فتح اور جنگ ختم ہو جانے کے بعد آئندہ کسی کو قتل نہ کرونگا۔ اور میرے بعد میری اولاد بھی اس اصول پر عمل کرے۔" اس تاریخ سے دکن میں یہ عام قاعدہ ہو گیا کہ لڑائی کے بعد جو شخص زندہ ہاتھ آئے وہ ہلاک نہ کیا جائے۔ اور بلا سبب عامۂ رعایا اور ضعیفوں کا قتل عام نہ ہو۔ اِس طرح

---

[۱] یہ پہلا وقت ہے جبکہ ہندوستان کے اندر ساحل سے قطع نظر رومیوں اور فرنگیوں کا داخلہ ملتا ہے۔ فرنگی تلاش روزگار میں عرب جہازوں کے ذریعہ سے آتے تھے۔ رومیوں سے آخری ترک مراد ہیں جو سیکڑوں مردہ ترک مسلم قوموں کی یادگار ہیں۔ یہ ترک سلجوقیوں کے بعد اسی طرح ابھرے جس طرح مصر میں صلاح الدین کے خاندان کے بعد مملوک۔ اصلی سلجوقی خاندان جوارض روم پر فرماں روا تھا اُس کو طغرل نے مدد دی جس کا بیٹا عثمان آخری سلجوقی بادشاہ کے بعد عثمانی شہنشاہت کا بانی ہوا جس کے نام سے یورپ صدیوں تھراتا رہا (۱۲۹۹ء یا اواخر ساتویں صدی ہجری) بہت جلد ان تازہ دم ترکوں نے اپنے فوجی نظام سے یورپ میں غلغلہ مچا دیا۔ اندلس اور صقلیہ کے راستوں کے بعد یہ مسلمان ترک یورپ میں پھر ایشیائے کوچک کے راستوں سے گھسے جو عرب فاتحین کا آغاز اسلام سے حروب صلیبیہ تک عام راستہ رہا تھا۔ ترکوں کے نظام فوجی ہی کا یورپ مقلد رہا ہے۔ ترکوں کا توپخانہ بھی انکی فتوحات کا بڑا سبب رہا ہے یہی زمانہ جس میں دکن میں اسلامی حکومت قائم ہوئی یورپ میں ترکوں کی پیشقدمی کا معاصر ہے۔ ۱۲

گویا بین الاقوامی قوانین بھی نشو و نما پا رہے تھے۔

سنہ ۷۷۶ھ میں پینتالیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ تقریباً ۱۸ سال حکومت کی۔

دیگر حکمرانانِ خاندان
محمد شاہ کے بعد اسکے اکلوتے بیٹے مجاہد شاہ نے، جو نا تجربہ کار انیس سالہ نوجوان تھا، سرحدات کی بحث میں کہ کرشنا فاصل رہے یا تنگبھدرا، بیجانگر پر حملہ کر دیا۔ لیکن بیجانگر فتح نہ ہو سکا اور واپسی کے وقت تین ہی سال کے بعد اپنے چچا داؤد بن علاء الدین کے اشارہ سے جسکو اس نے سخت سست کہدیا تھا مارا گیا اور جب داؤد بھی پینتیس روز کے بعد مجاہد شاہ کی بہن کے اشارہ سے نماز جمعہ میں بوقت سجدہ مارا گیا تو زمام سلطنت حلیم منش پرہیزگار محمود شاہ بن علاء الدین کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے بھی باپ کی طرح ایک بیوی پر قناعت کی۔ اسکے عہد میں خواجہ حافظ شیراز کو گلبرگہ آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ بیس سال کے ممتد عرصہ میں کوئی لشکر کشی نہیں کی۔

سنہ ۷۹۹ھ میں اسکے انتقال کے دوسرے دن رکن رکین قیام سلطنت بہمنیہ ملک نائب سیف الدین غوری[۱] وکیل سلطنت کا ایک سو سات سال کی عمر میں انتقال ہوا جو علاء الدین کا دست و بازو اور اس وقت سے ابتک سلطنت کا مدار المہام تھا۔

اسکے بعد چار پانچ مہینے سترہ اور پندرہ سالہ فرزندان محمود کی شاہ گردی رہی۔ بالآخر فیروز شاہ بن داؤد شاہ جس نے اپنے چچا محمود شاہ کے زیر تربیت میر فضل[۲] اللہ انجو سے تعلیم پائی تھی تخت نشین ہوا۔

---

[۱] سیف الدین غوری علاء الدین کا قدیم رفیق تھا۔ علاء الدین کی بیوی اسکی بہن تھی۔ اسکی بیٹی محمد شاہ سے بیاہی گئی تھی۔ نہایت فرزانہ، نیک سیرت مدبر گذرا ہے۔ رسالہ نصائح الملوک اسکی یادگار کتاب ہے۔ بہمنی انتظام سلطنت اسی کا قایم کیا ہوا ہے۔ (تاریخ عبد الجبار خاں تصنیف صفحات ۷۰-۷۴)

[۲] ۸۰۰ھ میر فضل اللہ انجو کو فیروز شاہ نے اپنا وزیر مقرر کیا۔ وہ صرف کتابی عالم نہ تھا بلکہ فنون جنگ کا بھی اچھا ماہر تھا اس کی بیٹی شاہزادہ حسن سے بیاہی گئی اور بادشاہ کی خاندانی بیٹی کا اس کے بیٹے سے عقد عمل میں آیا۔ ۱۲

فیروزشاہ متعدد زبانیں جانتا تھا۔ ہر ملک کے لوگوں سے انکی زبان میں گفتگو کرتا۔ عالم بھی تھا۔ خود بھی تدریس کا شغل رکھتا تھا۔ اس کا دربار علماء کا ملجا اور اس کا برتاؤ ان سے بے تکلفانہ تھا۔ بڑا کتب خانہ قایم کیا۔ قرآن مجید کا ہر روز پاؤ جزو اپنے ہاتھ سے لکھتا۔ دکن میں وہ مامون کی یاد تازہ کرنے والا تھا۔ اس کا یہ قول گویا مامون کے قول کا ترجمہ ہے "بہترین تحفہ ہر مملکت مردم صاحب کمال آں مملکت است"۔ عقلی طریقہ کی طرف اس کا رجحان تھا۔ چنانچہ مختلف مذاہب کے لوگوں سے میل جول رکھتا۔

نویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کا عام نقشہ

محمد تغلق کے بعد تخت دہلی پر پھر کوئی زبردست مدبر قایم نہیں ہوا اور اسکی وجہ سے بتدریج اس وقت ہندوستان میں اسلامی عہد میں تخت دہلی پر کمزور فرماں روایاں کی حکومت کی وجہ سے پھر وہی حالت عود کر آئی جو فتوحات اسلامی کے پیشتر یہاں مختلف راجوں کی تھی اور جسکو بلحاظ ہندوستان کی وسعت کے جسکے لحاظ سے اسکو بجائے خود براعظم کہا جاتا ہے محل تعجب نہیں کہا جا سکتا۔ ہر ایک صوبہ میں خود مختار اسلامی فرماں روا قایم تھے اور ان میں جنگ وجدل نوامیس قدرت کے لحاظ سے اٹل تھا۔ اسی انقسام وطوایف الملوکی کے دور دورہ میں تیمور نے مغلی فوج کشی، جو اس سے پہلے ہندوستان پر غیر مسلم حالت میں ہوا کرتی تھی اب اسلامی رنگ میں تازہ کر دی۔ تیمور صاحب قران نے اپنی عالمگیر فتوحات سے سکندر یونانی کی یاد تازہ کر دی۔ اس وقت کی مہذب دنیا میں اسی کا نقارہ بج رہا تھا۔ فیروزشاہ بہمنی نے بھی تیمور کے پاس اپنی سفارت بھیجی۔ تیمور نے اس کو "فرزند خیر خواہ" سے خطاب کیا۔ غرض ہندوستان میں گلبرگہ اس وقت امن وامان، علم و تہذیب اور تمدن میں سب سے پیش پیش تھا۔

فیروزشاہ کے اوصاف

اپنے خاندانی اصول کے خلاف زائد از معمول مذہبی محبت کا اس میں

بڑا سخت عیب تھا۔ چار سے زیادہ عورتوں کے جواز کیلئے حسب مشورہ آنجو مدار المہام متعہ کا حیلہ اختیار کیا
گیا۔ فیروز آباد بھیما ندی کے کنارے اسی کا بسایا ہوا ہے، جہاں مختلف محلات شاہی، قصر فیروزہ
وغیرہ تعمیر ہوئے اور ان میں دور دور ممالک کی حرم سرائیں مہیا کی گئیں۔ فیروز شاہ نے اکبر کے پیشتر
اسکو رہ نمائی کرنے کیلئے مہاراجہ بیجانگر اور راجہ کھرڑلہ (برار) کے لڑکیوں سے بھی شادی کی رسم انجام
دی۔ مہاراجہ بیجانگر کی لڑکی کی شادی کی دھوم دھام تاریخوں میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ فیروز شاہ
کا بیجانگر میں بطور داماد بہت دھوم کے ساتھ داخلہ ہوا (۸۰۲ھ)۔ اپنی آخری عمر میں اس نے بیجانگر
کے دیورائے ثانی سے ایسی بری شکست کھائی کہ جو اسلامی فتوحات کے آغاز سے اب تک کبھی
نہیں ہوئی تھی۔ آنجو مدار المہام مارا گیا۔ اس وقت فیروز شاہ کے بھائی احمد خان خاناں نے جو ہمیشہ
اپنے بھائی کا قوت بازو سپہ سالار رہتا، بہت سنبھالا۔ دیوراؤ کو ملک سے نکالا۔ آنجو کے مرجانے سے
دربار کا انتظام بگڑ گیا۔ غلاموں کا رسوخ بڑھ گیا۔ انھوں نے فیروز شاہ کو احمد کے خلاف ابھارا۔ احمد
مجبوراً حفاظت خود اختیاری میں گلبرگہ سے بھاگ نکلا اور مجبوراً مقابلہ کے لئے سامنے آیا۔ فیروز شاہ
بذات خود دراصل انتظام کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ احمد کو خلف حسن بصری[1] تاجر کی ڈپلومیسی سے کامیابی
حاصل ہوئی۔ نیک دل فیروز شاہ نے جو بیماریوں میں گھل رہا تھا قومی رجحان کے لحاظ سے مجبور ہو کر
منصب شاہی سے استعفا دے دیا اور احمد شاہ کو شاہ بننے کی خود مبارک با دی۔ استعفا سلطنت
کے دس روز بعد وہ پچیس سالہ حکومت اور پچپن سال کی عمر میں ۸۲۵ھ میں مرگیا۔ شاہان سابق کے

---

[1] یہ دراصل تاجر تھا جو احمد کا ساتھ دے کر میدان سیاست میں داخل ہو گیا۔ اور آئندہ بہت بڑی ناموری اس
میدان میں حاصل کی۔ اس زمانہ میں مسلمان ہی تمام بحری تجارت کے مالک اور نہایت دولتمند تھے۔ جیسا کہ ہم
وقتاً فوقتاً لکھ آئے ہیں اس تمول کی وجہ سے وہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لیتے تھے۔ فوجی گھوڑوں وغیرہ کی خریدی
فیروز شاہ کے زمانے میں اسکے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ وہ ملک التجار کہلاتا تھا۔

مختصر گنبدوں کے سامنے فیروز شاہ کا اپنا بنایا ہوا عالیشان بلند چوڑ گنبد گا بر گہ میں اب بھی اس کی عظمت کی یاد تازہ کر رہا ہے جو اُسکے عہد میں سلطنت بہمنی کی تھی۔ لیکن یہی عروج گویا اسکے اجڑنے کی علامت تھی۔

احمد شاہ احمد شاہ ولی مرید خاص حضرت سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے حسن سے نیک برتاؤ برتا جو مستثنےٰ مثال ہے۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں حدود سلطنت کی توسیع زیادہ تر احمد شاہ ہی کی جوانمردانہ کارگزاری سے ہوئی تھی جو اس کا سپہ سالار رہا تھا۔ اس کا عہد بہمنی عظمت و شان کا معراجِ کمال ہے۔ خلف حسن بصری اس کا مدار المہام بنا۔

ورنگل اِسلامی شہر محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں گولکنڈہ سرحد قرار دے کر ورنگل راج کیساتھ جو عہدنامہ قرار پایا تھا وہ تقریباً پون صدی تک برقرار رہا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں ورنگل نے بیجانگر کی مدد کرکے بہمنی حدود میں فوج کشی کی تھی۔ بیجانگر سے صلح ہو جانے کے بعد احمد شاہ نے ورنگل کا رخ کیا۔ دراصل بیجانگر کا نیا راج جو زمانہ کے اقتضاء کے لحاظ سے وجود میں آیا تھا تمام چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو اپنے دائرہ اقتدار میں جذب کر لیا تھا۔ اور اس طرح ورنگل کا دائرہ اقتدار بہت محدود ہو گیا۔ احمد شاہ کے اس حملہ کے وقت (۸۲۸ھ) راجہ کے پاس صرف سات ہزار فوج مہیا ہو سکی۔ احمد شاہ کے ورنگل پہونچنے کے پہلے ہی اس کا سپہ سالار خان اعظم کے زیر علم سُلطان پور (ورنگل) اب مستقلاً دولت آباد کی طرح اسلامی شہر بن گیا۔ بیجانگر نے کوئی مدد نہیں دی۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ ذاتوں کا اختلاف ہی احمد شاہ کو فتح ورنگل کی رہبری کر رہا تھا۔ راجہ میدانِ جنگ میں کھیت رہا۔ مولوی بشیر الدین احمد لکھتے ہیں "معلوم نہیں ہوتا کہ راجہ کا نام کیا تھا۔ اور پرتاب رد سے کیا قرابت رکھتا تھا[۱]"۔ غرض یہ کہ معمولی کمزوری کی بدولت یہ پرانا راج گمنامی کے اخیر درجے پر پہنچ چکا تھا جبکہ وہ فنا ہوا۔

---

[۱] ضمیمہ تاریخ بیجاپور صفحہ ۵۹۶۔

تبدیل دارالسلطنت ۸۳۵ھ سلطنت بہمنی کے حدود اب بہت وسیع ہو گئے۔ الماس کی کان پر بھی جو کلم (برار) کے قریب تھی قبضہ کیا گیا اور اس توسیع حدود کی وجہ سے بلحاظ مرکزی مقام احمد شاہ نے بیدر[۵] کو بنام احمد آباد پایۂ تخت قرار دیا جو ایک حد تک وسط قلمرو میں تھا۔ مرہٹواڑی، کرناٹک، تلنگانہ تینوں علاقوں کو اس مقام سے قربت تھی۔ چنانچہ یہاں مرہٹی، کنڑی، تلنگی تینوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس طرح بیدر رونق تازہ پا کر گلبرگہ اجڑنے لگا۔ احمد شاہ بیدر کا لطف زیادہ عرصہ تک اٹھانے نہیں پایا۔ دو تین سال کے بعد ہی وہ اس بیدر میں بارہ سال کی حکومت کے بعد فوت ہو گیا (۸۳۸ھ)۔ جہاں اس کا عالیشان مقبرہ اب بھی اپنی طرف سیاحوں کی کشش رکھتا ہے۔

فتح کوکن احمد شاہ کے زمانہ کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ خلف حسن بصری کو اس نے کوکن (واقع دریائے عمان) پر بھی بھیجا جہاں کے راجہ اس وقت خود سر ہو گئے تھے۔ خلف حسن بصری نے نہ صرف خود سر علاقہ کو مطیع بنا لیا بلکہ مہایم (قریب بمبئی) پر بھی قبضہ کر لیا جو حکومت گجرات سے

---

[۵] بیدر بہت سطح مرتفع پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے (۲۳۳۰) فٹ بلند ہے۔ آب وہوا خوش گوار، پانی میں فولاد کی آمیزش۔ زمین سرخ پتھریلی ہے۔ قدیم تاریخی شہر ہے۔ چوبارہ پرانے زمانہ کی یادگار اب تک وہاں باقی ہے۔ چار مینار ممکن ہے کہ اسکی تقلید ہو۔ راجہ بھیم سین یہیں کا مشہور راجہ گذرا ہے۔ جس کا عدل، بہادری، اور فیاضی مشہور ہے۔ شہرۂ آفاق دمن اسی کی بیٹی تھی۔ نل مالوہ کا راجہ تھا۔ نل اور دمن کی داستان جسے فیضی نے سنسکرت سے فارسی جامہ پہنایا فارسی ادب میں ممتاز رتبہ رکھتی ہے۔ اگرچہ بیدر کسی وقت ہندوستان کا ممتاز دارالحکومت تھا۔ لیکن بقول منشی بھیم نارائن شفیق آصف جاہی ورنگل کے دارالحکومت تلنگانہ بننے کے بعد بیدر کی شہرت ماند پڑ گئی تھی اور وہ گمنامی کے گوشہ میں چلا گیا تھا۔ اُس وقت وہ ایک اجڑے دیار کی حیثیت رکھتا تھا جب کہ احمد شاہ نے اسکو از سر نو مثل گلبرگہ اسلامی رنگ میں آباد کیا۔ فرشتہ لکھتا ہے "میں نے ہندوستان کے اکثر شہر دیکھے ہیں۔ لیکن بیدر کی سی لطافت بہت کم دیکھی۔ زمین تھی ہوئی شنگرف کی طرح لال ہے۔ برسات میں جو ہندوستان کا بہترین موسم ہے یہاں کیچڑ نہیں ہوتی۔"

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

تعلق رکھتا تھا۔ اس سے گجراتی اور دکنی اسلامی کشاکش پیدا ہوئی۔ بہمنی فوج کو شکست ہوئی اور بالآخر علماء کی کوشش سے صلح اس بنیاد پر قایم ہوئی کہ ہر ایک حکومت سابقہ حدود کی پابندی کرے۔

علاء الدین ثانی علاء الدین ثانی معمولی دل و دماغ والا حکمراں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دربار میں پارٹی فیلنگ پیدا ہونے لگی۔ بادشاہ بجائے اسکے کہ حکمتِ عملی سے توازن قایم رکھے اس ہوا کو اور تیز کرنے لگا۔ اسلامی دربار میں بجز نو مسلم امراء کے جنکی تعداد نہایت کم تھی باقی سب امراء باہر سے ہی آئے ہوئے تھے۔ لیکن بامتداد زماں انہی میں دو پارٹیاں قایم ہوئیں۔ "دکنی" (پہلے آئے ہوئے غیر ملکی) اور حبشی ایک پارٹی بنی۔ "غریب" دوسرے۔ یہ غریب "مغل" تھے جو خاصہ خیل (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتے تھے اور تازہ وارد ہونیکی وجہ سے زیادہ بھروسہ کے قابل ہوتے جس طرح نو وارد ترک غلام دربار عباسیہ میں۔ عربوں کی بھی بھرتی فوج میں ہونے لگی تھی۔ اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ عرب جو معتصم کے وقت سے شاہی درباروں سے بے تعلق تھے صدیوں کے بعد اب پھر انکی فوج میں بھرتی ہونے لگی۔ دکن میں جہازوں کے راستہ سے ہر وقت نو وارد عربوں اور ایرانیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ عرب بھی "غریب پارٹی" میں تھے۔ علاء الدین نے سوء تدبیر سے خلف حسن بصری کی نمایاں کارگزاریوں کے صلہ میں حکم دیدیا کہ دربار اور جلوس وغیرہ میں غریب سیدھی طرف رہیں اور دکنی بائیں طرف، بقول فرشتہ "بایں التفات ازاں تاریخ تا بحال در دکن فتنہ خیز میان دکنیاں وغریباں عداوت قایم شد"۔

اہل دربار کی پارٹی فیلنگ کا اثر اس طور پر نمودار ہوا کہ خلف حسن بصری جب دوسری بار کوکن

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) چونکہ زمین سرخ و سخت ہے لہذا سیر و شکار کے وقت گھوڑے اور آدمی ٹھوکر نہیں کھاتے۔ ... ایرانی میوے وہاں ہوتے ہیں"۔ محمود گاواں نے جس کا ذکر آئندہ آئیگا " زعفران اور مختلف قسم کے انگور بھی اس زمین سے حاصل کئے تھے۔ یہی بیدر ہے جہاں اب زعفران تو دور رہے انگور بھی ناپید ہیں۔ ۱۲

کی طرف گیا تو وہ سرکہ نامی ایک مقامی سرغنہ کی دغابازی سے راستے میں مارڈالا گیا اور بقول مولوی محمد عبدالجبار خاں صاحب مسلمان افسروں کی دغابازی سے مارڈالے جانے کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ جسکی تجدید آیندہ سیواجی کے دور میں ہوئی۔ ایسے زبردست سپہ سالار کا مارا جانا کچھ کم نہ تھا کہ اس پر دکھنیوں اور غریبوں کی خانہ جنگی بدبختی کی نمایاں علامت تھی۔ کلمہ گویان اسلام نے اپنے بھائیوں سے وہ سلوک کیا جو غیر مسلموں سے بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ واقعہ گویا اس خوں فشاں سلسلہ واقعات کا آغاز تھا' جس کے متعدد نظائر آئندہ بہ کثرت ملتے جائیں گے۔ علاء الدین ۸۶۲ھ میں تقریباً چوبیس سال کی حکومت کے بعد مرگیا۔

ہمایوں | علاء الدین کا جانشین ہمایوں نہایت سفاک گزرا ہے۔ جس کے نام کے ساتھ "ظالم" کا لقب جزءِ لاینفک ہوگیا ہے۔ بہت جلد تین ہی سال کے اندر وہ مرگیا۔ اور اُس کا بیٹا نظام شاہ آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ انتظام مملکت اسکی ماں نرگس بانو (فیروز شاہ کی پوتی) کے ہاتھ میں آیا جو ایک منتظم عورت گزری ہے اور چاند بی بی کے پہلے دکن میں اُس نے انتظام حکومت میں جنس نسواں کے اعلیٰ اوصاف کا ایک قابل ستایش نمونہ پیش کیا ہے۔

اس وقت دربار کے دو زبردست رکن خواجہ جہاں (ترک) اور محمود گاواں[۱] (مغل) تھے۔ گویا ایک کونسل آف ریجنسی تھی۔ اس عہد میں محمود شاہ خلجی فرمانروائے خاندیس نے بیدر فتح کرکے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ قریب تھا کہ سلطنت بہمنیہ کا چراغ گل ہوجائے لیکن دربار بہمنی کی ڈپلومیسی کامیاب ہوئی کہ جسکی استدعا پر محمود شاہ گجراتی اپنی اسی ہزار فوج کے ساتھ امداد کے لئے چلا آیا اور اس طرح محمود شاہ خلجی خستہ حال واپس چلا گیا[۲]۔

---

[۱] محمود گاواں بھی تاجرانہ رنگ میں ایران سے دکن میں آیا اور ترقی کرکے میدان حکومت میں اُس نے مضبوط قدم جمائے۔ [۲] اس قسم کی باہمی جنگ وجدل کو اس وقت چودھویں صدی کے وسط میں حسن نظر (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

نظام شاہ عین جشن شادی میں تخت کی رات کو دس سال کی عمر میں دفعتہً اس پُرفریب دنیا سے چل بسا اور اس کا بھائی محمد شاہ لشکری ثانی آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا وہی ریجنسی قایم رہی۔ لیکن خواجہ جہاں ترک کی کم ظرفی اور غرور ونخوت سے جلد دو تین سال ہی کے بعد اس کا پیمانہ حیات لبریز ہوگیا اور بحکم نرگس بانو وہ مار ڈالا گیا۔ اور اب خواجہ عماد الدین محمود گاواں کے پورے عروج کا زمانہ آیا۔

محمود گاواں بہمنی وزرا میں سیف الدین غوری آنجو، خلف حسن بصری علی الترتیب نامور افراد گزرے ہیں جو مجلس علم وفن، بزم سیاست، میدان جنگ ہر جگہ ممتاز نظر آئینگے۔ محمود گاواں علم وفن، تدبیر صائب جنگ آزمائی کے ساتھ ساتھ پاک مشربی اور نہایت برگزیدہ کیرکٹر کا بے بہا جوہر رکھتا تھا جس سے وہ ہمیشہ کیلئے زندۂ جاوید رہ گیا۔ اسکی پبلک اور پرائیوٹ لایف "فقر اندر قبائے شاہی" کا ممتاز نمونہ تھی۔ اور یہی چیز تھی جس نے بجائے کسی عالی شان محل سرائے یا خوش نما مقبرے کے بیدر میں وہ عالیشان خوش آیند یونیورسٹی کالج اپنی یادگار چھوڑی ہے جسکو آج کے دن بھی انسان دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ اوہ! پانچسو برس پہلے بیدر میں کیسا عالیشان دار العلوم قایم تھا۔ جو کیا بلحاظ خوبی عمارت، خوش نمائی، زیبائی، اور کیا بلحاظ تمام ضروریات تعلیمی (لکچر ہال، بورڈنگ ہوس) وغیرہ کے چودھویں صدی کے کسی ممتاز کالج سے کم نہیں۔ اُس نے اپنا دھن من تن قوم کے قوم بنانے میں نثار کر دیا۔

قصہ مختصر اس بے مثل تعلیمی یادگار کے ساتھ اس کا عہد مدار المہامی بہمنی انتہائی سیاسی عروج کا

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) سے دیکھا جائیگا وہ ظاہر ہے لیکن خود اس وقت بھی یہی سمجھا جاتا تھا کہ ایسی خونریزیاں مذہب سے دور ہیں۔ چنانچہ شمس الدین حق گو کے جواب میں محمود شاہ نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ یہ سب حملہ آوری سیاسی لحاظ سے ہے اور مذہباً ناجائز او یلبسکم شیعاً ویذیق بعضکم باس بعض اسی کا مصداق ہے۔ ۱۲

زمانہ ہے۔ اگرچہ کوکن پر پہلے بھی فوج کشی ہوتی رہتی تھی لیکن اب وہ بالکلیہ مفتوح کر لیا گیا۔ مغربی گھاٹ پر سنگسر کا راجہ اس وقت بہت ذی اقتدار تھا۔ وہ بحری قزاقوں کا گویا سرغنہ تھا جسکے ماتحت تین سو جنگی کشتیوں کا بیڑہ تھا۔ محمود گاواں نے سنگسر کا قلعہ فتح کر لیا۔

یہاں سے وہ گوواؔ کی طرف بڑھا جو اس وقت سلطنت بیجانگر کا مشہور بندرگاہ تھا۔ سلطنت بیجانگر کے پاس اس وقت زبردست بیڑہ جہازات کا بھی موجود تھا۔ لہذا گاواں نے بھی ایک سو بیس جہازوں کا بیڑا تیار کر کے سمندر کی طرف سے بھی حملہ کیا اور خود خشکی کی راہ سے آگے بڑھا۔ چنانچہ فتح گووا اُس کا مشہور کارنامہ ہے جسکی نوید اُس نے تمام شاہان بیرون ہندوستان کے پاس بھی بھیجی تھی اور جسکی وجہ سے سلطنت بہمنیہ کی ہندوستان سے باہر شہرت میں ممتاز اضافہ ہو گیا۔

اس طرف گوواتک سرحد وسیع ہو گئی تو دوسری طرف راج بندری پر بھی سلطنت بہمنی کا اقتدار قایم ہو گیا۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ تلنگانہ کا راج تو احمد شاہ بہمنی کے وقت ختم ہو چکا تھا لیکن اوڑیسہ کا راج باقی تھا۔ جس کے حدود اس طرف کے ساحل سمندر راج بندری تک پہونچتے تھے۔ اوڑیسہ کے راجہ نے خود سلطنت بہمنی پر نظام شاہ کے وقت میں حملہ کیا تھا جو اچھی طرح روکا گیا۔ اُس کے مرنیکے بعد اوڑیا راج کے خاندان میں تزاع برپا ہوئی۔ جو راجہ راج سے محروم ہو گیا تھا اس نے سلطنت بہمنی سے مدد طلب کی چنانچہ بہمنی تائید سے اسکو پھر راج ملا۔ سپہ سالار فوج بہمنی حسن نظام الملک بحری (بانی خاندان احمدنگر) راجہ کو اسکے راج پر قبضہ دلانے کے بعد راج بندری تک آگے بڑھتا ہوا چلا گیا جو اس وقت اُس راجہ کی حکومت سے علیحدہ تھا۔ اور اسطرح اس پر بہمنی جھنڈا لہرانے لگا۔ فتوحات کی

ؔ گووا ابھی خلجی عہد کے حملوں کے وقت اسلامی حکومت میں آگیا تھا۔ محمد تغلق کے عہد میں جب ابن بطوطہ نے سیاحت کی تھی تو اس وقت بھی وہاں اسلامی حکومت تھی۔ جب بیجانگر کی حکومت عروج پذیر ہوئی تو اُس پر بیجانگر کا قبضہ ہو گیا تھا۔ عجائب الاسفار صفحہ ۳۰۷۔

لہر خود بخود ایسی بڑھ رہی تھی کہ آخر محمد شاہ غازی بذات خود مچھلی بندر سے ہوتے ہوئے کنجی (قریب مدراس) جا پہنچا جو کرناٹک کا قدیم دار الحکومت تھا، اور جسکے مندر یادگار زمانہ ہیں۔ فتوحات کی اسقدر وسعت کافور کے فتوحات کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ اور اس وسعت کے لحاظ سے ضرور تھا کہ انتظام مملکت میں بھی تبدیلی عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ گاواں نے بجائے چار کے آٹھ صوبے کر دئے تا کہ صوبیداروں کو خود مختاری کی ہوس نہ پیدا ہو۔ نیز ہر صوبے میں کچھ تعلقے بہ مصالح انتظامی صرفخاص قرار دئے گئے تا کہ شاہی نگرانی ہر صوبہ میں براہ راست ہو سکے۔ صوبیداروں کے اقتدارات گھٹا دئے گئے اس سے پہلے صوبیداروں کو اپنے صوبے میں پورے اختیارات حاصل رہتے تھے۔ اِس سمت کے تمام قلعہ داروں کا تقرر بھی ان کا اقتداری ہوتا تھا۔ محمود گاواں نے قلعداروں کے تقرر کا اقتدار صوبیداروں سے سلب کر لیا۔ صوبیدار کی ماتحتی میں براہ راست صرف ایک قلعہ رکھا گیا۔ باقی قلعوں کے افسر راست دربار شاہی سے نامزد ہونے لگے اور قرار دیا گیا کہ انکے اخراجات بھی خزانہ سے ادا ہوں۔ "بندوبست مالگزاری" پہلی دفعہ اسی نے آغاز کیا۔ یہ سب اصلاحیں سوسائٹی کی عام افتاد کے لحاظ سے اُسکی جان ستانی کا آلہ بن گئیں، اور سفید ریش محمود گاواں ۷۸ سال کی عمر میں اپنے عالیشان مدرسہ کے خوشنما مناروں کو بطور منارِ ہدایت یادگار چھوڑ کر جو کل ہندوستان میں تعلیمی کوشش کی ستشنے یادگار ہے ۵ صفر ۸۸۶ھ میں شربت شہادت کے ساتھ بقاء دوام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

چوں شہید عشق در دنیا و عقبیٰ سرخ روست خوش دمے باشد کہ ما را کشتہ زیں میداں برند

گاواں کا زبردست ہاتھ اٹھ جانے کے ساتھ ہی پارٹی فیلنگ کا زور بڑھنے لگا۔ اسکی پہلی برسی کے چند روز پہلے ہی یکم صفر ۸۸۶ھ کو ۲۹ سال کی جوان عمری میں شراب کے خنجر جگر سوز نے محمد شاہ کا کام تمام کر دیا۔ بارہ سالہ محمود شاہ کے جلوس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ امراء سلطنت کو باہم ایک دوسرے

سے حفاظت خود اختیاری کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ حریف غالب کہیں دوسرے کی جان نہ لے ڈالے۔ یوسف عادل خاں جو محمود گاواں کا دست گرفتہ اور متبنیٰ تھا ترک و مغل (پردیسی) پارٹی کا لیڈر بنا اور اُس نے دربار میں اپنی مخالف پارٹی کا اثر غالب پاکر حفاظت خود اختیاری کے طور پر بجز اسکے اور کوئی صورت نہیں پائی کہ بیجا پور کے دور مقام پر بیٹھکر دربار کے اثر سے نکل جائے۔ اس طرح ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا۔ دربار کی غالب دکنی پارٹی کا لیڈر نظام الملک بحری ہو گیا تھا۔ محمود گاواں کے بعد وہی مدار المہام حکومت تھا۔ اُس کا بیٹا احمد جنیر کا صوبیدار تھا۔ نظام الملک کا اعلیٰ اقتدار دوسرے امراء کے لئے کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ آخر محمود گاواں کی طرح اُس کا بھی سر کاٹا گیا۔ جس پر اُس کا بیٹا احمد نظام الملک کھلم کھلا آزاد بن گیا۔ اب دو ٹکڑے ہو گئے۔ برار تو دور دراز کا صوبہ تھا۔ لہذا اُسکی علیحدگی پر کوئی تعجب ہی نہیں۔ یہ تین ٹکڑے ہوئے۔ بادشاہ کی کمزوری اور دلدادہ عیش و نشاط ہونے کی وجہ سے دربار کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی تھی۔ آخر امیر برید کا اثر اسقدر غالب ہو گیا کہ اسکے سامنے بادشاہ برائے نام رہ گیا۔ قطب الملک صوبیدار گولکنڈہ کو خوبی قسمت نے اس موقع پر خود بخود مستقل فرماں روا بنا دیا۔ اسطرح ایک زبردست بہمنی سلطنت کی جگہ پانچ خود مختار ریاستیں پیدا ہو گئیں۔

اب بہمنی سلطنت ختم ہو گئی۔ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے (جسکے جواہرات اب بکنے لگے تھے) ویسے ہی بے بس ہوتے تھے جیسے بغداد و مصر کے خلفاء عباسیہ۔ آخر کلیم اللہ بہمنی نے بابر کے زمانے میں بیدر سے بھاگ کر احمد نگر میں پناہ ڈھونڈی۔ لیکن زمین اُسکے لئے تنگ ہو رہی تھی۔ آخر وہیں ۹۳۴ھ میں زمین اُسکے وجود سے خالی ہوئی یا خالی کر دیگئی۔ اسکی لاش بیدر میں لاکر دفن کی گئی، اور خاندان بہمنی صرف تاریخوں میں یادگار رہگیا۔ یہی سنتہ اللہ ہے جب کہ تخت نشین تخت کے قابل نہ رہیں۔ ولن تجد لسنة الله تبدیلا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ؕ

باب پنجم

پانچ ریاستیں

جیسے بغداد سے اندلس و مصر کی خود مختاری تمدنی ترقی کا باعث ہوئی اس طرح دکن میں ان پانچ ریاستوں کا علیحدہ قایم ہوجانا تمدنی بہار کے لئے مفید بارش کا کام دینے والا تھا۔ بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ ہرگز دنیا میں ایسے مشہور نہ ہوتے اگر بیدر میں ہی تمام شانِ حکومت کا جلوہ رہتا۔ دن بدن یہ نظر آتا جائے گا کہ ترفہ اور تعیش کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں نزاکت بڑھتی جاتی ہے اور اُسکے ساتھ ساتھ لامحالہ بلند نظری اور جرأت گھٹتی جاتی ہے۔ یوسف عادل شاہ، احمد نظام شاہ، قطب الملک ایسے زبردست دل و دماغ والے اور عالی جذبہ نہ تھے جیسا کہ علاء الدین بہمنی تھا۔ اور گو تمدنی بہار کی رنگ برنگی ان چمنوں میں زیادہ نظر فریب معلوم ہوگی لیکن جو عظمت ایک واحد بہمنی سلطنت کے زمانہ میں تھی وہ گویا ان پانچ خود مختار ریاستوں میں مفقود ہوگی۔ سونے کا سکہ جو ان ریاستوں میں جاری نہ ہوسکا وہ اس کی زبردست دلیل ہے۔ خاندان ہائے ریاست کے ان بانیوں میں یوسف اور قطب الملک دونوں ایرانی شیعہ تھے۔ نظام شاہ اور عماد الملک ہندی الاصل نومسلم، قاسم برید ترک اگرچہ سُنی تھا۔ الحاصل جسطرح بہمنی سلطنت کے حالات میں بیان ہوچکا ہے۔ ان صوبیداروں نے سمجھا کہ انکی بقا اسی میں ہے کہ وہ مستقل ہوجائیں، ورنہ نہ صرف انکی جان ہی معرض خطر میں ہوگی بلکہ انتظام ملک کی کل بھی بگڑ جائیگی ٹھیک اسی نمونہ پر یہ ریاستیں وجود میں آئیں جسطرح محمد تغلق کے زمانے میں دہلی سے علیحدگی ضروری ہوگئی تھی۔ غرض سوسائٹی کی عام رفتار خود ان ریاستوں کو وجود میں لانے والی تھی۔

فصلِ اوّل

بیجا پور

یوسف عادل شاہ اِس ویران مرکزِ تمدن کی بنیاد یوسف عادل شاہ نے ڈالی جس طرح اور بھی خاندانوں کا شجرۂ نسب اُن کے عروج پانیکے بعد کسی بڑے اصل تک پہنچانے کی کوشش کیجاتی ہے اُسی طرح یوسف کا سلسلۂ نسب خاندانِ ترکانِ آلِ عثمان تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد مولف تاریخ بیجا پور نے اُس "ہلالِ عثمانی" کو جو بیجا پور کی تمام شاہی عمارتوں پر موجود ہے اس طبعی میلان کے ثبوت میں پیش کیا ہے[۱]۔ لیکن جب یہی "ہلالِ عثمانی" گولکنڈہ کے قطب شاہیہ کے مقابر میں بھی دیکھا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ علامت بادشاہوں کے مقابر کے ساتھ مخصوص تھی، دوسروں کے مقابر کیلئے اس کا استعمال نہیں کیا گیا[۲] تو یوسف عادل شاہ کے ترکانِ آلِ عثمان سے ہونے کی شہادت کمزور ہو جاتی ہے۔ بہرکیف وہ ترک نسل سے ہوسکتا ہے اسکا نشوونما ساوہ میں ہوا[۳]۔ اور ساوہ کے نشوونما کا اثر ہی تشیع کا خیال اسمیں جمانیوالا تھا۔

جس طرح اب انگلستان سے لوگ یہاں آتے اور ناموری و شہرت حاصل کرتے ہیں اُسی طرح اُس زمانے میں ایران سے تازہ وارد تلاشِ روزگار میں چلے آتے اور چونکہ برخلاف اہلِ یورپ کے جن پر زبردست ضابطہ مسلط ہے ان پر کوئی روک نہ ہوتی تھی لہذا وہ بلند ترین کنگرۂ عزت تک با آسانی پہنچ جاتے تھے۔ اسی قسم کے روزگار آزما نوجوانوں کی ایک اعلیٰ مثال یوسف تھا۔ یہ جہازی مسافر بھی

---

[۱] تاریخ بیجا پور صفحہ ۲۸ [۲] شہادت سیاح مغربی تھیونو صفحہ ۵۶۹ [۳] بیجا پور کی بادشاہی کے بعد بھی خیال وطن نہ بھولا جاتا تھا۔ چنانچہ بیس ہزار ہن کے صرف سے ساوہ میں مسجد اور منار بنایا شہر میں نہر کا پانی لایا گیا۔

اور تازہ وارد نوجوانوں کی طرح روزگار آزمائی کیلئے ساوہ سے پھرتا پھرتا بیدر میں گاواں جیسے مربی علم و فن مشہور مدار المہام کے حضور میں آپہونچا، اور اس زمانے کے لحاظ سے اپنی اعلیٰ فوجی اور انتظامی قابلیت کی بدولت سلطنت بہمنی میں بتدریج ترقی پاتے ہوئے صوبیدار بیجاپور کے اعلیٰ رتبہ کو حاصل کرلیا۔ گاواں کے پاس اس کا بہت اعزاز تھا۔ گاواں کی شہادت اور محمد شاہ کی وفات کے بعد جب اس نے دیکھا کہ دربار بیدر میں بادشاہ سلامت کمسن ہیں اور تمام اقتدار مخالف پارٹی کے ہاتھ میں ہے تو حفاظت خود اختیاری کے اصول پر بجز اسکے چارہ نہ تھا کہ آزاد ہو جائے۔ چنانچہ پہلے ہی آزاد ہوا جسمیں بُعد مقامی کی وجہ سے بھی مدد ملی (۸۹۶ھ)۔

یوسف کی شخصیت یوسف عادل شاہ کا شہاب الدین غوری اور علاء الدین بہمنی سے مقابلہ کیا جائے تو عظیم الشان فرق معلوم ہوگا۔ شہاب الدین غوری کی فاتحانہ عظمت کے ساتھ سادہ زندگی، اور علاء الدین بہمنی کے نیک اور پاکیزہ جذبات کا اب ترفہ اور عیش پسند سوسائٹی میں نشو و نما پانا ناممکن تھا۔ یوسف بھی اگرچہ ایرانی سوسائٹی کے اثرات سے رنگین مزاج اور عیش پسند تھا، تاہم وہ تمام اوصاف ایک بڑی حد تک اس میں موجود تھے جو ایک بانی خاندان حکومت کیلئے درکار ہیں۔ وہ نہایت وجیہ، بارعب، عالی ظرف، حلیم الطبع، جری، معدلت پسند نیک نفس تھا۔ خوشنویس بھی تھا۔ شاعری تو اس سوسائٹی میں لازمی چیز تھی۔ موسیقی میں کمال تھا۔ طنبور عود عمدہ طور پر بجاتا اور اس فن کا قدردان تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں استاد گیلانی اور استاد حسین قزوینی جیسے استادانِ فن موسیقی موجود تھے جنھوں نے

بوئے پیراہن یوسف زجہاں گم گشتہ بود — عاقبت سر زگریبان تو بیروں آورد

کی نظم میں نئے نئے صوت پیدا کئے جس پر چھ ہزار ہن انعام مرحمت ہوا۔ اسکی مجلس میں قدما کے اشعار پڑھے جاتے۔ خود بھی کبھی کبھی شعر کہتا۔ اربابِ کمال کا قدرداں تھا، دور دور سے اہلِ کمال طلب کئے

اور انکو نہایت قدر و منزلت سے رکھا۔

تشلیع ریاستی مذہب یوسف عادل شاہ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ محمود غزنوی کے زمانہ سے لیکر ہندوستان میں یہی پہلا حکمراں ہے جس نے تشلیع کو شاہی مذہب قرار دیا۔ ہم تمہید میں بصراحت بیان کر آئے ہیں کہ فاطمیت اور باطنیت سواحل کے مسلمانوں میں قدیم سے چلی آرہی ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ کن سیاسی اسباب و وجوہ سے اسلامی دنیا میں ان جذبات کے نشو و نما میں مدد ملی۔ قصہ مختصر تسلسل کلام کے لحاظ سے یہاں اسقدر تذکرہ کافی ہے کہ صلاح الدین کے مصر پر اقتدار حاصل کرنیکے بعد فاطمیت اپنے اصلی مرکز اقتدار سے نابود ہوگئی تو اسکے بعد مغلیہ سیلاب نے باطنیت کو بھی ایران میں کچل ڈالا۔ بہت جلد مغلیہ خونی سمندر کی روانی میں تفرقہ پڑگیا' اور اسطرح سوسائٹی کے فاسد مادے پھر راستہ ڈھونڈنے لگے۔ باہمی انقسام اور طوایف الملوکی جو پھر پیدا ہوگئی تھی' آخر ایک منتظم حکومت کی تلاش کررہی تھی اور اہل بیت کی محبت کے ہمہ گیر جذبہ نے خاندان صفویہ کو جو در اصل پیری مریدی کا خاندان تھا فاطمیت اور باطنیت کے سیاسی مقصد کو اثنا عشریہ کے قالب میں زندہ کردینے کا خود بخود موقع دیدیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ادھر یوسف نے ۹۰۸ھ میں بیجاپور میں ائمہ اثنا عشر کا خطبہ پڑھا[۱] تو اسکے قریب قریب ۹۰۵ھ میں اسمٰعیل صفوی نے آذربایجان پر چڑھائی کی اور رفتہ رفتہ شروان پر حملہ آور ہوکر وہاں کے فرمانروا کو شکست دی تھی[۲] اس وقت تک کی ہزار سالہ مجمل تاریخ اسلام پر ہی سرسری نظر ڈالو تو صاف معلوم ہوگا کہ ایک جاعل الظلمات والنور کی ہی مشیت ہے جو کبھی ایک رنگ جماتی ہے تو پھر دوسرے رنگ کیلئے سامان مہیا کرتی ہے۔ ایک رنگ پورے بہار کو پہونچتا ہے تو پھر دفعۃً اسمیں خزاں کی آمد ہونے لگتی ہے۔ ایک مدت کے بعد پہلا رنگ جمنے لگتا ہے

---

[۱] اہل سنت کے کثرت تعداد کے لحاظ سے آزادی مذہب کا اصول بھی مسلم رہا۔ آئندہ چل کر یوسف کے بیٹے اسمٰعیل نے دربار صفویہ سے عقیدت مندانہ تعلق پیدا کیا اور شاہان صفویہ کا نام خطبہ میں لیا جانے لگا۔ [۲] شعر العجم جلد ۳ صفحہ ۲۔

غرض مذہبی نقطۂ نظر سے بلا کسی فرقہ داری خاص اصول کے قرآن مجید کی اس آیت کا مضمون صادق ہے کہ " حق و باطل دنیا میں کبھی صاف نہ ہو" ہر وقت اصول تدافع کا جلوہ نظر آتا ہے۔

اصول تدافع | اصول تدافع کا جلوہ یوسف عادل شاہ کے زمانہ میں ایک اور رنگ میں نظر آیا ہے۔ اس نئے منظر کو بخوبی سمجھنے کیلئے ہمیں اپنا سین بدلنے کی ضرورت ہے۔ اِسوقت تک ہمارا سین ایشیا ہی کے کسی نہ کسی خطہ میں رہا ہے لیکن اب فنون کا آفتاب ارضِ مغرب سے نکلنے کو ہے اور اسلئے اس موقع پر کسی قدر وضاحت کی ضرورت ہے۔

غرناطہ اور قسطنطنیہ | یہ ایک عجیب تاریخی حسنِ اتفاق یا دراصل اصول تدافع مشیت ایزدی ہے کہ قسطنطنیہ میں سینٹ صوفیا کے چرچ کو جس وقت سچے پیروانِ مسیح علیہ السلام کی بدولت مسیح علیہ السلام کی سچی تعلیم توحید کا شرف حاصل ہوا تو اسی کے قریب زمانے میں اندلس سے مسلمانوں کا اخراج ہوا ۲۱ مئی ۱۴۵۳ء م جمادی الثانی ۸۵۷ھ کو سینٹ صوفیا کے چرچ میں محمد فاتح کی تلوار کے سایہ میں ندائے توحید بلند ہوئی اور بظاہر تمام مسیحی دنیائے یورپ میں اس سے زلزلہ پیدا ہو گیا۔ اُس وقت جبکہ تمام خطۂ یورپ میں جہالت، وحشت اور نا اتفاقی کے بھوت پھیلے ہوئے تھے ایک اسکے جنوب مغربی گوشہ میں جہاں غرناطہ پر ابھی علم اسلام لہرا رہا تھا، قدرت نیا رنگ پیدا کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی ریاست استوریا، جو دامنِ دولتِ اسلام میں سیاہی کے خفیف داغ کے طور پر تھی، دن بدن طاقتور بن رہی تھی۔ بعینہٖ جو صورت یہاں ترکوں اور عیسائیوں کی تھی وہاں وہی برعکس عیسائیوں اور عربوں کی تھی۔ قسطنطنیہ کے عیسائی محض نالائق اور نفسانیت میں غرق تھے اور انکی نا اتفاقیوں نے آخر انکو ترکوں سے روزِ بد دکھایا۔ ترک اُن عیسائیوں کے مقابلہ میں زندہ قوم تھے۔ انکے دلوں میں ایک زندہ رکھنے والی اسپرٹ یا شعلہ حیات زور و شور سے فروزاں تھا۔ انکی ہمتیں زبردست، انکے ارادے قوی اور اُن کا عزم راسخ تھا۔ اُن میں زبردست "ڈسپلین" تھی۔ باقاعدہ اڈمنسٹریشن تھا۔ وہ حریت مذہبی کے راز سے

واقف تھے اور وہ مفتوح قوم کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ اسکے برخلاف اندلسی عرب اُس وقت اُس ذلت کی حالت میں گرفتار تھے جس میں قسطنطنیہ کے عیسائی گرفتار تھے۔ اُن میں زندہ رکھنے والا شعلۂ حیات عیاشی اور نفسانیت کے گرداب میں پھنسکر ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ اُن میں ہمت کا نام باقی نہ رہا تھا۔ اور مشہور تاریخی ہیرو و سپہ سالار کی ہمت افزا تقریریں انکے حق میں محض بے سود تھیں۔ محمد ثانی بلکہ خود انہی کے اسلاف طارق اور موسیٰ کے خیالات اور جذبات کا مقابلہ ان بزدل اشخاص سے کرنا محض اُن کے نام پر دھبہ لگانا ہے۔ یہی بزدلی تھی جس نے ابوعبداللہ شاہ غرناطہ کو ۸۹۸ھ م ۱۴۹۲ء میں یعنی فتح قسطنطنیہ سے چالیس سال کے بعد غرناطہ پر آخری پرحسرت نگاہ ڈالتے ہوئے اس خطہ یورپ سے اسلامی جھنڈی کو رخصت کردینے پر مجبور کیا جو ابتک وہاں دوبارہ قایم نہیں ہوا۔

برخلاف ان مسلمانوں کے فرڈی نینڈ شاہ اراگان اور ایزابیلا شاہ کیٹیل کے باہمی ازدواج سے یہ دونوں عیسائی ریاستیں ایک ہوگئی تھیں۔ انکی طاقت اِسقدر زبردست ہوگئی تھی کہ انھوں نے بآسانی مسلمانوں کو اندلس سے نکالدیا۔

ترکوں اور پرتگالیوں میں فرق لیکن اسکے ساتھ ہی ترکوں اور پرتگالیوں میں بڑا فرق ہے۔ پرتگالی اگرچہ جنگی روح رکھتے تھے لیکن شایستگی اور حریت مذاہب میں ترکوں سے انکو کوئی نسبت نہیں ہی محمد ثانی نے جو برتاؤ کیا اسکے ثبوت میں آج بلغاری و یونانی نہ صرف دنیا میں زندہ ہیں بلکہ اپنے محسنوں کے مقابلہ کیلئے تیار ہوکر دنیا کی اسٹیج پر نمودار ہیں۔ فرڈی نینڈ و ایزابیلا نے کیا کیا؟ اِس کا جواب اپنی طرف سے ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود محققین یورپ نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے اسلامی تمدن کے بعد ملک میں بجائے زرخیزی کے اُن پرتگالیوں کے وحشیانہ ظلم وستم، بدتہذیبی و ناشایستگی نے سرسبز اور شاداب خطۂ اندلس کو جہنم بنادیا۔ اندلس کی یادگار زمانہ صنعت و حرفت خاک میں مل گئی۔ پرتگالی وحشی تاتاریوں کی طرح ایک بلا تھے۔

پرتگالیوں کی ترقی | اندلس سے اسلام خارج ہونیکے بعد دوسرے ہی سال انہی پرتگالیوں کی بدولت ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے امریکہ کی نئی دنیا پرانی دنیا کے روبرو پیش کی اور اس طرح سے مسیحی دنیا میں ایک ایسی عظیم الشان قلمرو کا اضافہ ہوا جس کا خیال کرنا ہی اسکی وسعت کے تصور کیلئے کافی ہے۔ پرتگالی جہاز رانوں نے جو نئی راہیں ڈھونڈھ نکالیں انکی بدولت اسلامی دنیا میں مسیحی اثر نئے انداز سے روز افزوں بڑھنے لگا۔

بقول ڈریپر "پندرھویں صدی کے قبل سائنس کو جو کچھ ترقی حاصل ہوئی مسلمانوں کی بدولت ہوئی۔ عیسائی دنیا پر جہل و اوہام کی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ مسیحیوں کو علمی مسائل کی ہوا تک نہ لگی تھی وہ مجسمہ پرستی، گور پرستی، عشاء ربانی، کرامات اولیا، تصرفات ارواح وغیرہ کے گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس خواب غفلت سے مسیحی دنیا پندرھویں صدی کے خاتمہ تک بیدار نہ ہوئی۔ اس وقت بھی شوقِ علم اسکے جاگنے کا باعث نہ ہوا بلکہ اسباب ترغیب کچھ اور ہی تھے۔ یعنی اقوام یورپ میں تجارتی رقابت پیدا ہو گئی"۔ کولمبس واسکوڈی گاما۔ فرڈینینڈ میگلن کی جہاز رانی نے دنیا میں نیا دور پیدا کیا۔

نیا بحری راستہ | تاریخی علوم متعارفہ میں داخل ہے کہ یورپ میں ایشیا خصوصاً ہندوستان کی زرخیزی اور زرریزی کے افسانے گھر گھر ضرب المثل تھے۔ یورپ کی زمین اس قابل نہیں کہ خود بخود دولت پیدا کرے اور نہ صنعت وحرفت کا بازار گرم تھا۔ ایشیا ہی کے زروجواہر سے یورپ کو کچھ ٹکڑا نصیب ہو جاتا تھا اور اسکے لئے ہی ان میں باہم رقابت ہوتی رہتی تھی۔ بقول ڈریپر "ایشیاء کی تجارت نے ان مغربی اقوام کو جو اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں ہمیشہ مالا مال کیا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس تجارت کا بڑا مرکز اٹلی کا شمالی حصہ تھا۔ جنیوا اور وینس کی جہاز رانی کی اس زمانے میں دھوم تھی جو دراصل مسلمانوں سے ہی سیکھی ہوئی تھی۔ اور اس قابلیت کی وجہ سے وینس نے حروب صلیبیہ

پرتگال والے مسلمانوں کے جانشین بن رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی جہازرانی بھی سیکھ لی اور چونکہ مسلمان ہی اسوقت آفریقہ کی تجارت کے مالک تھے لہذا اہل پرتگال کو اُنکے قدم بقدم چلنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ بعض مصری یہودیونکی زبانی پرتگال والوں کو معلوم ہوا کہ براعظم مذکور کے منتہائے جنوب میں ایک راس ہے جس کا عبور بآسانی ہوسکتا ہے۔ اس اطلاع کی بنا پر تین جہازوں کا بیڑا بسرکردگی واسکوڈی گاما جولائی ۱۴۹۷ء کو پرتگال سے روانہ ہوا اور بتاریخ ۱۷ نومبر راس امید کو قطع کرنیکے بعد ۱۹ مئی ۱۴۹۸ء م ۸۹۳ھ کو کلی کوٹ میں لنگر انداز ہوا جو جنوبی ہندوستان کا مشہور تاریخی ساحلی مقام ہے۔ مشرق کے اس سفر کی بدولت حسب فرمان پوپ اہل پرتگال کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا حق حاصل ہوگیا۔

واسکوڈی گاما کی تاریخی شہرت بیان کرنی غیر ضروری ہے۔ وہ ان مشاہیر عالم میں سے ہے جو دنیا کی تاریخ میں نیا دَور پیدا کرتے ہیں۔ یورپ کو ہندوستان کا یہ راستہ کیا ملا در حقیقت دنیا کی صورت ہی بدل گئی۔ ایشیا یورپ کا مارکٹ بن گیا۔ الٹی گنگا بہنے لگی۔ اس نئے راستہ سے جو عظیم الشان نتائج پیدا ہوئے ان کا اظہار ڈریپر کے الفاظ میں اسطرح ہوسکتا ہے کہ "اخفائے واقعات ممکن نہ تھا۔ سوفسطائیانہ تاویلیں بے کار تھیں۔ وینس اور جنیوا کی تجارت کا چراغ گل ہوگیا۔ یورپ کی شکل بدل گئی۔ بحری طاقت اُن ممالک سے جو بحر روم کے سواحل پر واقع تھے رخصت ہوگئی۔ اور وہ ملک جو بحر اوقیانوس کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے تھے جہازرانی کا مرکز بنگئے۔"

اندلس کے خاتمہ کے ساتھ گویا اسلامی بحری طاقت کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ اندلس میں بحری طاقت جیسی زبردست تھی وہ بنی عباس کو بھی نصیب نہیں تھی۔ اسلئے پرتگال والوں کو اس طویل راستہ میں کوئی انسانی طاقت مزاحم نظر نہیں آئی۔ اور آخرکار یورپین جھنڈا سب سے پہلے ایشیا کی زمین میں بلند ہوگیا۔

ہندی مسلمانوں اور پرتگالیونکا فرق اسوقت کی اسلامی حکومتوں اور پرتگال والوں میں جوفرق تھا وہ شیخ زین الدین ملیباری نے تحفۃ المجاہدین میں نہایت صحیح طور پر بیان کیا ہے۔ اِس موقع پر اسکا انتخاب نامناسب نہیں۔

"مسلمان بادشاہ باہم نااتفاقی کی بلا میں مبتلا تھے۔ ایک دوسرے سے بدگمانی سلطنت کی پالٹکس تھی۔ بادشاہ کو اپنی ذات کے برخلاف سازش کا خوف ہر وقت گھیرے رہتا تھا۔ اس کے برخلاف اہل پرتگال مکار اور دھوکہ والے ہیں۔ اپنے معا"ت کی مصلحتوں سے باخبر۔ وقت ضرورت اپنے دشمنوں سے عاجزی کرنے لگتے ہیں اور جب ضرورت نکل جاتی ہے تو پھر ہر ممکن طور سے اُن پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ سب کے سب نہایت اتفاق رکھتے ہیں۔ اپنے افسرونکے حکم کی مخالفت نہیں کرتے۔ باوجودیکہ وہ اپنے بادشاہوں سے نہایت دور مسافت پر ہیں بایں ہمہ انمیں بہت کم اختلاف ہوتا ہے اور یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ ان میں سے کسی نے اپنے افسر کو خود حکومت حاصل کرنیکی غرض سے مار ڈالا ہو اور اسلئے باوجود انکی اقلیت کے ملیبار کے راجہ انکے مطیع ہو گئے ہیں۔"

یہ امر قابل غور ہے کہ جو تصویر مسلمانوں اور اقوام یورپ کے خصائل کی پندرھوں صدی کے آخر میں کھینچ گئی ہے چار سو برس کا عرصہ گزرنیکے بعد بھی کیا کچھ بھی بدلی ہے؟

پرتگال کا عروج پرتگالیوں کی جہازرانی کی بدولت مسلمان عرب تاجرونکی تجارت گھٹ گئی۔ پرتگالی بتدریج تمام تجارت پر قابض ہو گئے اور مسلمان عربوں کی عظیم الشان جہازرانی کا نام صرف تاریخ میں یادگار رہ گیا۔ اس وقت مصری حکومت کمزور ہو رہی تھی۔ نیز ترک اور مصری باہم کشمکش میں مبتلا تھے، اور ہندوستان میں طوایف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس طرح زمانہ پرتگال والوں کا مساعد تھا۔ تجارت سے آگے بڑھکر پرتگالیوں نے اپنی سلطنت کا جھنڈا بھی ہندوستان میں گاڑ دیا۔ اسطرح فرزندانِ ارض مغرب بھی سرزمین ہند کے کچھ نہ کچھ حکمراں بنگئے۔

یوسف عادل شاہ سے مُٹ بھیڑ یوسف عادل کا ہی زمانہ تھا جبکہ پرتگالیوں نے گووا پر بھی حملہ کیا (۹۱۵ھ م ۱۵۱۰ء) اور اس پر قبضہ بھی کر لیا۔ پرتگالیوں نے گووا میں وہ مظالم کئے جنکی نظیر تاریخ ہند میں نہیں ملتی۔[۱] اگرچہ یوسف عادل شاہ نے گووا پھر واپس لے لیا۔ لیکن اسکی واپسی کے بعد پرتگالیوں نے تھانہ دار کو رشوت دیکر پھر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اور یوسف کے مرنے کے بعد کمال خاں کی ریجنسی کے زمانے میں (جس کا ذکر آئندہ آئے گا) گووا اسلامی اقتدار سے خارج اور پہلی مغربی آنے والی قوم کی حکومت میں تسلیم کر لیا گیا۔ کمال خاں نے اس شرط پر ان سے مصالحت کر لی کہ صرف قلعہ انکے قبضہ میں رہے اور اس سے آگے قریوں اور قصبوں میں وہ پیشقدمی نہ کریں۔ بقول فرشتہ "بعہد و شرط وفا کردہ بحوالی سلطنت عادل شاہیہ مزاحمت و تشویش نمی رسانند۔"

اسمٰعیل یوسف نے مکٹ راؤ مرہٹہ سردار کی بہن سے جو مسلمان ہو گئی تھی اور پونجی خاتون کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے نکاح کیا تھا جس سے اسمٰعیل ولی عہد بھی پیدا ہوا۔ پچھتر سال کی عمر پانیکے بعد یوسف دنیا سے رخصت ہوا۔ اور حسب وصیت مقام گوگی میں جو منجانب سلطنت بہمنی اس کی عطا شدہ جاگیر تھی اور جہاں وہ قبل از سلطنت رہا کرتا تھا پائین مزار حضرت شاہ چندا حسینی جن سے اسکو نہایت عقیدت تھی دفن ہوا۔[۲] اس سے عیاں ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی تشیع نے وہ غلو پیدا نہیں کیا تھا جس کا جلوہ بعد ایرانی دور میں نظر آتا ہے۔

باپ کے انتقال کے وقت چونکہ اسمٰعیل ۱۲ سال کا کم عمر بچہ تھا لہٰذا کمال خاں دکھنی[۳] ریجنٹ

---

[۱] تاریخ بیجاپور بشیر الدین احمد صفحہ ۱۳۸ [۲] یوسف اور اسکے جانشین اسمٰعیل کے مزار پر گنبد نہیں ہیں۔ اس سادگی کا آئندہ عالیشان بیجاپور کے گنبدوں سے مقابلہ کرو۔! گوگی سرکار عالی کے علاقہ میں واقع ہے۔

[۳] دکھنی کی اصطلاح یہاں وہی ہے جو فی الحال جاری ہے یعنی جن کو باہر سے آئے ہوئے عرصہ گزرا ہے ورنہ وہ اصلاً اراب جروی تھا۔ بشیر الدین احمد صفحہ ۴۳

قرار پایا۔ کمال خاں کو خود شاہی کی ہوس پیدا ہوئی لیکن پونجی خاتون کی دلیری اور معاملہ سازی کی بدولت اسمٰعیل کے جانباز فدائی کاکا کے ہاتھ سے مارڈالا گیا۔ اور اب اسمٰعیل خود حکمراں بنا۔ حکمراں ہونیکے بعد اُس نے اپنے اعمال سے ثابت کردکھایا کہ وہ باپ کا سچا جانشین ہے۔ ایرانی اور ہندی امتزاج نے اچھے نتائج پیدا کئے۔ وہ بھی حلیم الطبع، عالی مشرب، بلند حوصلہ نکلا۔ نفاست پسند اور اسقدر پاکیزہ اخلاق تھا کہ فحش اسکی زبان پر نہ آتا۔ اہل علم سے صحبت رکھتا۔ شاعری و موسیقی کا ذوق آبائی تھا۔ وفائی تخلص۔ نقاشی، رنگ سازی، تیر سازی میں ماہر تھا۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ طوایف الملوکی

تختِ دہلی محمد تغلق کے سامنے ہی کمزور ہونے لگا تھا اور اس کا نتیجہ تھا کہ کل ہندوستان کا اب قریب وہی سیاسی نقشہ ہورہا تھا جو اسلامی دور کے پہلے تھا۔ ایک وسیع برعظم میں مختلف حکومتیں راج کررہی تھیں اور اس افتراق کی صورت میں توازن قوا کا اصول خود بخود عملی صورت میں آنے لگتا ہے۔ چنانچہ اسی بیجاپور کی قوت بڑھانے اور بریدیہ و بیجانگر کو توڑنے کیلئے جسکے راجہ نے پرتگالیوں کی مدد سے اسمٰعیل کو سخت شکست دی تھی۔ اسمٰعیل عادل شاہ و حسین نظام شاہ کے باہم روابط اتحاد قایم ہوئے۔ دونوں میں باہم رشتہ بھی قایم ہوا۔ اسمٰعیل کی ہمشیرہ مریم سلطان بنت یوسف کی شادی برہان نظام شاہ سے عمل میں آئی۔ مگر بہت جلد ثابت ہوگیا کہ شاہی خاندانوں کے تعلقات سیاسی افق پر بے اثر ہیں۔ غرض ان پانچ ریاستوں اور بیجانگر کا دور وجود باہمی جنگ و جدل کی مسلسل داستان سے بھرا ہوا ہے جسکی تفصیل بقول لی بان اب وفتر لایعنی ہے۔ مختصر طور پر یورپ کی مثال ہمیں اپنے روبرو رکھ لینی چاہئے۔ یہاں بھی ہر وقت پالسی بدلتی رہتی تھی جسمیں مذہب یا شاہی خاندانوں کے رشتہ سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ بارہا بیجانگر والے کسی مسلمان ریاست کے ساتھ شریک ہو کر دوسری اسلامی ریاست پر چڑھائی کرتے اور یہ اُس دور میں ایک معمولی بات ہوگئی تھی۔ ۹۴۱ھ میں

فتح گولکنڈہ کی حسرت دل میں لئے ہوئے تیس سال کی بُرامان جوانی میں اسمٰعیل کا انتقال ہوگیا اور گوگی میں اپنے باپ کے جوار میں دفن کیا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ اول اسمٰعیل کے بعد اس کا بڑا بیٹا ملو چھ مہینے کی حکومت کے بعد اپنے نالائقی کی وجہ سے معزول اور ابراہیم جانشین ہوا۔ جسکے اوصاف اسکے باپ کے وقت انتقال سی ہی لوگوں کو گرویدہ بنا رہے تھے۔ لیکن جلد باز تھا۔ تحمل اور عاقبت اندیشی نہ تھی۔ اس نے سنتِ آبائی کے برخلاف سنیت اختیار کی اور یہی مذہب حکومت قرار پایا۔ امرائے مغل معزول کئے گئے۔ فارسی دفتر برخاست اور اسکے عوض مرہٹی دفتر قایم کیا گیا۔ برہمن مامور کئے گئے۔ مغل بیجانگر چلے گئے جہاں پہلے سے بہت سی مسلمان فوج موجود تھی اور ہر طرح نووارد مسلمان سپاہیوں کی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ بہر کیف اسد خاں مدار المہام[۱] کی تجربہ کاری ابراہیم کے ذاتی کمزوریوں کی روک تھام کر رہی تھی۔

ابراہیم کی سوء تدبیری سے امرا میں بددلی پیدا ہوگئی۔ شاہزادہ عبداللہ کی سازش جب افشا ہوگئی

---

[۱] اسد خاں لاری سلطنت عادل شاہیہ کا ویسا ہی نامور مدار المہام ہے جیسے سلطنت بہمنی میں ملک سیف الدین۔ نہایت دانشمند، مدبر اور منتظم گزرا ہے۔ فیشن کا بھی موجد تھا۔ اسکے مخترعات سے قبا، خنجر، زین دکن میں مشہور ہیں۔ ہاتھی کیلئے بھی زین لگام بنائی تھی لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کمال خاں کی خودسری کی ہوس پکانیکے وقت اُسنے شاہی خاندان کی جانبازی کے ساتھ رفاقت کی اور اسی بنا پر دربار میں اس کا بڑا اعزاز تھا۔ بالآخر وہ ریاست کا مدار المہام اور سپہ سالار اعظم تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اسکی لڑکی سے شادی کی لیکن آخر میں اسلامی معاشرت و تمدن کے عام نقص کی بدولت باہمی دراندازیوں سے اَن بَن ہوگئی تھی۔ اگرچہ مرنیکے وقت پھر صفائی ہوگئی۔ سنہ ۹۵۶ھ میں ملک سیف الدین کی سی ہی طویل سو برس سے زائد عمر میں بلگاؤں جاگیر میں اُسکا انتقال ہوا اور وہیں اسکا مقبرہ مشہور ہے۔ بقول بشیر الدین احمد اسکی شہرت ایک ولی کیطرح ہے۔ مسلمان اور ہندو دونوں اسکے معتقد ہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ مسلمان اور ہندو دونوں کی ضروریات زندگی کو سمجھ گیا تھا اور اسی پر اُسنے اپنی انتظامی پالیسی قایم کی جو اسکی کامیابی کا سبب تھی۔۱۲

تو اُس نے کئی مسلمان اور ہندو امرا کی گردنیں اڑا دیں۔ شاہزادہ عبداللہ نے گووا میں جاکر پرتگیزوں کی پناہ لی۔ اور اگرچہ پرتگالی گورنر نے بہت کچھ روپیہ اینٹھ لیا جزائر سالسٹ وغیرہ حاصل کر لئے لیکن عبداللہ واپس نہیں ملا۔ زمانہ مابعد کے مغربی طریقہ عمل کی ابتدا یہیں سے نظر آتی ہے۔ بہرحال اُس کی سوء تدبیری سے برہان نظام شاہ کا پلہ بھاری ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مرض الموت میں بھی اُس نے بہت سے اطبا مروا ڈالے حکیم ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوا فروشوں نے پیشہ چھوڑ دیا۔ غرض دو سال تک بیماریوں کا شکار رہ کر اور اپنی اولاد کو اپنے ذاتی مذہب کے برخلاف رنگ میں دیکھ کر چوبیس سال کی سلطنت کے بعد ۹۶۵ھ میں مر گیا۔

علی عادل شاہ اس کا زمانہ بیجاپور کے عروج کا زمانہ ہے اور اس کو شاہان عادل شاہیہ کا گل سرسبد کہنا چاہئے۔ تین بھائیوں کو ناقص بنا کر وہ تخت نشین ہوا۔ اور باپ کے خلاف خاندانی مذہب پھر جاری کر دیا۔ قصہ مشہور ہے کہ اسکے بچپن میں ایک دفعہ باپ نے خدا کا شکر کیا کہ اسکی توفیق سے "میں نے اپنے باپ دادا کے مذہب سے بری ہو کر دینِ حق اختیار کیا" اسی وقت وہ بول اٹھا کہ اگر دینِ آبا ترک کرنا اچھی بات ہے تو سب بیٹوں کو ایسا ہی کرنا چاہیئے" ابراہیم غصہ میں آکر پوچھنے لگا کہ "تیرا مذہب کیا ہے" علی نے جواب دیا کہ "اب تو بادشاہ کا مذہب رکھتا ہوں۔ آئندہ خدا عالم ہے" اس جواب سے ابراہیم کو یقین ہو گیا کہ علی شیعہ ہے۔ اور اس کا باعث اُس نے علی کے استاد خواجہ عنایت اللہ شیرازی کو خیال کیا اور حسبِ فتویٰ اسکو مروا ڈالا لیکن اسکے بعد جو استاد مقرر کیا گیا یعنی مُلّا فتح اللہ شیرازی وہ بھی دراصل شیعہ تھا۔ اگرچہ حنفی مشہور تھا۔ غرض ابراہیم کے بعد پھر وہی عادل شاہی رنگ قایم ہو گیا۔ بہرکیف علی بلحاظ اپنی اعلیٰ قابلیت کے تاریخ میں مشہور ہے۔ اگرچہ علمی استعداد معمولی تھی لیکن اہل کمال کی قدردانی میں وہ اپنے خاندان میں سب سے آگے بڑھ گیا۔ ان کے لئے اُس نے وظیفہ مقرر کئے۔ اسکی تمام ہمت یہی رہتی کہ اس کا دربار اہل کمال کا ملجا ہو۔ چنانچہ بیجاپور اسکے زمانے میں

اپنے عروج پر تھا۔ باپ کا اندوختہ جسکی مقدار ڈیڑھ کروڑ ہُون تھی اُس نے اہل علم وکمال پر صرف کر دیا۔ عدل وانصاف میں مشغول ہوا۔ اور اس طریقہ سے انتظام مملکت جمایا کہ محاصل میں اضافہ ہوگیا۔

بیجانگر کی تباہی | ابھی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ مختلف حکومتوں کی وجہ سے مذہب سیاست پر قربان ہو گیا تھا۔ مسلمان مسلمانوں کے برخلاف ہندؤں سے مدد لیتے۔ چنانچہ جب بیجاپور والوں نے بیجانگر والوں کے ساتھ احمدنگر پر حملہ کیا تو یہ مشہور ہے کہ ہندوں نے مسجد و مصحف کی بیحرمتی کی۔ اسلامی حکومتوں کے تعدد کی وجہ سے بیجانگر کی عظمت بہت بڑھ گئی تھی۔ بیجانگر کے ماتحت اُسوقت ساٹھ بندرگاہ تھے۔ بارہ کروڑ ہُوں محاصل ملک تھا۔ اس روز افزوں اقتدار نے آخر اسلامی حکومتوں کو بیدار کیا۔ علی عادل شاہ کی مصلحت اندیشی سے قریب قریب کل اسلامی ریاستوں میں رام راج والی بیجانگر کے برخلاف سیاسی اتحاد قایم ہوا۔ حسین نظام شاہ کے روبرو مصطفےٰ خاں اردستانی[1] کی تقریر جسکو اس اسکیم کے کامیاب بنانے کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ اُس زمانہ کی سیاسی حالت کا آئینہ ہے۔ " در عہد شاہان بہمنیہ کہ تمام عرصہ دکن جولانگہ سمند دولت بود گاہے اہلی اسلام غالب میشدند گاہے کفار بیجانگر استیلامی یافتند۔ اکثر سلاطین بہمنیہ بساط منازعت را برچیدہ با ان جماعت مواسا و مدارامی کردند۔ اکنوں کہ ولایت دکن بہ چندکس منقسم گشتہ است طریق عقل ان است کہ سلاطین اسلام متحد شدہ طریق موافقت مسلوک دارند تا از آسیب دشمن قوی ساخت سلطنت محفوظ ماند۔" الغرض اس اتحاد کا منصوبہ عمل پذیر ہوا۔ علی عادل شاہ نے احمدنگر کی مشہور زمانہ شہزادی چاند بی بی سے شادی کی علیٰ ہذا القیاس علی عادل شاہ کی بہن کی شادی مرتضیٰ ولی عہد نظام شاہیہ سے ہوئی بہ استثنا، برہان عماد الملک باقی چاروں ریاستیں متحد ہوگئیں۔ اور حجت اس طور پر تمام کی گئی کہ مقامات مدگل ورائچور کے استرداد کا

---

[1] یہ بھی ایک نامور نووارد ایرانی گزرا ہے۔ ابتداً دربار گولکنڈہ میں مدارالمہام (جملۃ الملک) تھا۔ پھر بیجاپور چلا گیا۔ کشور خاں کے بعد یہ مدارالمہام بھی ہوا۔ ۱۲

مطالبہ کیا گیا۔ رام راج نے ایلچی کو ذلیل کر کے دربار سے نکلوا دیا۔ اس پر کل متحدہ فوجوں نے بلکر بیجانگر کا رُخ کیا جنکی طاقت ان چاروں متحدہ ریاستوں سے زیادہ تھی۔ ستر ہزار سوار، چھ لاکھ پیدل اور دو ھزار ہاتھی اقل درجہ اندازہ ہے۔ متحدرؤسا کے پاس اسکی آدھی فوج بھی نہ تھی۔

نقشہ جنگ متحدہ فوجوں کے انجنیروں نے تیس چالیس کوس تک تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کی کہ گو دو تین گھاٹ موجود ہیں لیکن ایسا گھاٹ جہاں پانی کم ہو آرابہ (توپخانہ) اور لشکر گزر سکے یہی سامنے کا گھاٹ ہے۔ جسکو دشمن نے پوری طرح محفوظ کر لیا ہے اور ایک دیوار بنا کر اُس پر مختلف قسم کی آتش بازی نصب کر دی ہے۔ متحدین کی کونسل میں قرار پایا کہ بظاہر کسی گھاٹ کے دستیاب ہونیکی اشاعت کر کے یہاں سے چلدینا چاہیئے اور اس طرح جب دشمن سامنے سے ہٹ جائے تو پھر یلغار پلٹ پڑنا چاہیے۔ چنانچہ اسی تجویز پر عمل کیا گیا اور اس میں کامیابی ہوئی۔ متحدہ فوجیں یلغار پلٹ کر رود کرشنا سے اُتر آئیں اور رام راج کے کیمپ کی طرف روانہ ہوئیں جو پانچ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ لڑائی توپوں اور ہاتھیوں سے جاری رہی۔ آتش بازی کے ارابے زنجیروں سے جوڑے گئے رام راج کے پاس دو ہزار ہاتھی تھے اور وہ سنگاسن میں سوار تھا۔ ہندو فوجیں بان تفنگ، توپ، ضرب زن سے کام لے رہی تھیں۔ ایک دفعہ سب ملا کر پچاس ہزار فیر کرتے۔ اس معرکہ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ بڑا کام نظام شاہیہ کے توپخانہ سے ہوا جسمیں چھ سو توپیں تھیں، دو آ ابے، دو سو ضرب زن، دو سو زنبورک۔ اس توپخانہ نے جو نہایت مضبوطی کے ساتھ کام کر رہا تھا اور جو چلپی رومی خاں کی بدولت مرتب ہوا تھا، میدان جیت لیا۔ جو نتیجہ مشہور زمانہ محاربہ بایزید یلدرم اور یورپ کی متحدہ فوجوں کے معرکہ کا ہوا تھا۔ وہی اس لڑائی کا بھی ہوا۔ رام راج اپنی سوء تدبیری سے جیسے کہ عموماً ایسی فیصلہ کن لڑائی میں دیکھا گیا ہے گرفتار ہو کر بحکم حسین نظام شاہ مارا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ آدمی اس معرکہ میں کام آئے۔ ہاتھیوں کے سوا باقی تمام سامان لوٹنے کی فوج کو اجازت دیدیگئی۔

بیجانگر کے سربفلک محلات اور مندر جل کر خاک سیاہ ہوگئے۔ اور یہ عظیم الشان شہر آج ایک عبرت کی نشانی ہے۔ اس واقعہ کے گیارہ دن کے بعد حسین نظام شاہ جس کو اس معرکہ کا متحدہ سپہ سالار کہنا چاہیئے کثرت مے کشی و عیاشی سے مرگیا۔ تنگنا دری نے باقی وسیع ملک بچانے کیلئے دب کر صلح کرلی۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو حالت مسلمانوں کی تھی وہی ہندوؤں کی تھی۔ چنانچہ خود رام راج نے اصل خاندان حکومت سے حکومت چھین لی تھی اور رام راج کے بیٹے تمراج نے چچا سے ڈر کر علی عادل شاہ سے التجا کی کہ اس کو اپنے زمرہ امراء میں سمجھکر قلعہ اناگنڈی مرحمت ہو۔ چنانچہ یہ التجا منظور ہوئی اور علی نے اسکو بیٹا کہکر اناگنڈی کی حکومت عطا کی۔ ہندوؤں میں بھی طوایف الملوکی ہوگئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے راجاؤں نے سر اٹھایا اور خود مختار بن گئے۔ اسطرح کوئی ہندو حکومت اسلامی حکومتوں کے مدمقابل نہ آئی۔ بقول فرشتہ " ازان است کہ پس از حرب مذکور دیگر مزاحمت ایشاں بہ اسلامیاں نہ رسید"۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومتیں بھی کسی غیر کو سامنے نہ پاکر پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوگئیں۔ علی عادل شاہ نے پرتگالیوں سے گوا چھڑانا چاہا لیکن ناکامی ہوئی بہر کیف کرناٹک میں اسکی پیشقدمی کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھونی کی فتح جہاں کا ہندو صوبیدار رام راج کے بعد خود مختار بن گیا تھا۔ اسکی نمایاں فتح ہے۔ ۴۷ سال کی عمر میں ایک سازش سے اسکی جان گئی۔

سلطنت مغلیہ | ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اسلام کے جذاب اصول کی بدولت وہی مغل جنھوں نے " فرزندانِ عم مصطفےٰ " کا خون بے دریغ بہایا تھا چند ہی دنوں میں مصطفوی مذہب و تمدن کے زبردست حامی بن گئے۔ اسی آلِ چنگیز میں تیمور اُٹھا جس نے نہ صرف چنگیزی قلمرو زیر فرمان کیا۔ بلکہ سکندر کی یاد بھلادی۔ اسی تیمور کی نسل پر قدرتِ حق کی نوازش ہوتی ہے۔ بابر وطن سے بیوطن ہوکر افغانستان کی خاک چھانتے ہوئے ہندوستان جنت نشان میں مغل امپائر کا بانی بنتا ہے۔ یوں سمجھو کہ حد سے زیادہ انقسام جسکی بدولت کل ہندوستان میں ایک ہی ایک رول یا امن و امان

قایم نہیں ہو سکتا تھا اس امر کا داعی تھا کہ ہندوستان جلد پھر ایک امپائر کی شکل اختیار کرے۔ چنانچہ خود دربار دہلی کے امرا نے بابر کو ہندوستان جنت نشان آنے کی دعوت دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں پنجاب و شمالی ہند نے نہایت جوش دل سے نئے فاتح کا خیر مقدم ادا کیا۔ جب مغل امپائر شمالی ہند میں مضبوط اور مستحکم ہو چکی تو سنتہ التاریخ کے مطابق خود بخود اس امر کی ضرورت داعی ہوئی کہ علاء الدین خلجی کے نقش قدم پر دکن کی جانب پیشقدمی کی جائے۔ چنانچہ اسکی سب سے پہلی زد مالوہ و خاندیس کے بعد احمد نگر پر پڑی جس کا تذکرہ ہم احمد نگر کے بیان میں کرینگے۔ جب تک احمد نگر بیچ میں ہے۔ بیجاپور کو اور چند دن راج کرنے دیجئے۔ بہر حال اکبر کے سفیر علی عادل شاہ کے پاس بھی آئے تھے۔

ابراہیم ثانی | علی لاولد تھا لہذا اس کا بھتیجا ابراہیم ثانی ۹۸۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ چاند بی بی ریجنٹ رہی۔ خودسری کا علاج وہ کرتی جاتی تھی اگرچہ کامیابی کم ہوتی تھی۔ دلاور خاں کے زمانے میں جس کو دربار میں عروج ہو گیا تھا، سنت الجماعت سرکاری مذہب ہو گیا جس کو ابراہیم ثانی نے بھی بحال رکھا۔ مرہٹے بھی اب ابھرنے لگے تھے جنکی حیثیت پہلے سے ایک حد تک اپنے اندرونی معاملات میں ہوم رول کی سی تھی۔ عروج کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ ترفہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ ابراہیم ثانی ایک رنگیلا بادشاہ تھا جیسے تانا شاہ اور دہلی کا محمد شاہ۔ بہر کیف اسکے زمانہ میں بیدر عادل شاہیوں کے قبضہ میں آگیا۔ بریدی دنیا سے نابود ہو گئے۔ مغلیہ رو دن بدن بڑھ رہی تھی اور اس اعلیٰ طاقت کے روبرو ابراہیم اکبر کا پیش کش گزار بن گیا۔ اسکی بیٹی شاہزادہ دانیال سے بیاہی گئی۔ ۴۹ برس اس نے حکومت کی۔ آخر میں اسے بھگندر ہو گیا۔ ڈاکٹر کے علاج سے مرض بڑھ گیا۔ آخر اسی مرض سے انتقال ہو گیا۔

محمد عادل شاہ | ابھی تک پرانی بنیاد مضبوط تھی جسکی بدولت ابراہیم ثانی کے بعد محمد عادل تخت

پر بیٹھا۔ اب شاہجہاں کا زمانہ آیا۔ اگرچہ اس نے حملہ کیا لیکن صلح ہوگئی۔ بیس سال کا زمانہ جو صلح میں گزرا اس لحاظ سے مشہور ہے کہ اس میں محمد عادل نے کرناٹک کا رخ کیا۔ اس مہم میں مرہٹے محمد عادل کے جھنڈے کے نیچے لڑ رہے تھے۔ ویلور اور چنجی فتح ہوگئے۔ مصطفےٰ خاں اور ملک ریحان فاتحین کے نام مشہور ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں میر جملہ بھی قطب شاہوں کی طرف سے کرناٹک میں اپنا اگنگ رنگ جما رہا تھا۔ اس طرح دونوں ریاستیں فی الجملہ رقیب بھی تھیں۔ بہرکیف روب نایک لیجہ چنجی جو سات سو برس کی ہندو حکومت کا جانشین مگر عیش و عشرت سے انتظام بھولا ہوا تھا اور جسکے امراء اس سے بیزار تھے، عادل شاہیہ کے قبضہ میں آگیا۔ کافور اور تغلق کے بھولے ہوئے صوبے پھر اسلامی صوبے ہوگئے۔ اس سے پہلے عادل شاہی بادشاہ "شاہ" نہیں کہلاتے تھے محمد عادل ہی پہلا "شاہ" ہے۔ لیکن یہ خطاب اپنی تلوار کے بل پر نہیں تھا۔ بلکہ شاہجہاں کا عطیہ، اور اس لحاظ سے اس "شاہ" کی وہی وقعت ہے جو دوسرے نکمے خطابی مہاراجوں کی۔ عادل شاہی دور تقریباً دو صدیوں تک رہا۔ اس میں ان دونوں باپ بیٹے کا زمانہ اسّی برس ہے جو دورِ سکون کہا جا سکتا ہے۔ جو عمارت اولوالعزم اجداد نے تیار کی تھی اسمیں یہ دونوں آرام سے بیٹھے رہے۔ ترفہ دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ عالی شان عمارتیں بنتی جاتی ہیں۔ جن کی آرائش سونے سے کیجاتی ہے۔ نقش و نگار کی حد ہو جاتی ہے۔ شمشیر آبدار کے عوض محو دیدار بنانے والی رانیاں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ پرتکلف محلات میں غیر راحت رساں عیش و عشرت کی داد دیجاتی ہے۔ اسی زمانہ میں محمد عادل شاہ مرتا ہے اور علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوتا ہے۔ امیر ہی روبرتی جاتی ہے۔ اگرچہ عارضی طور پر چند روز کیلئے اورنگ زیبؒ نے شاہجہاں کی بیماری کے زمانہ میں صلح کرلی۔ لیکن اس سے عادل شاہی دربار نے کچھ سنبھالا نہیں لیا۔ بلکہ نتیجہ یہ ہوا کہ اس عرصہ مدت میں سیواجی کا زور بڑھ گیا۔ اور افضل خان سپہ سالار کا سیواجی کے ہاتھوں دغا سے مارا جانا تاریخ ہند میں ایک

نئے دَور کا آغاز کرتا ہے[1]۔ الحاصل دائرۂ ریاست دن بدن سکڑتا جاتا ہے۔ علی عادل شاہ صلح کرتا جاتا تھا۔ لیکن یہ مصالحت یورپین مصالحت کی طرح سے حکومت اعلیٰ کو اور راستہ دینے والی ہوتی تھی۔ ۳۵ سال کی عمر میں عیاشی کا شکار ہوکر سولہ برس کی حکومت کے بعد مرگیا اور آخری عادل شاہ سکندر پانچ سال کی عمر میں آبائی تخت پر بیٹھا۔ مختلف امرا، کی رقابتوں کو روکنے کے لئے کوئی زبردست ہاتھ نہ تھا۔ سیواجی نے مہاراجہ کا لقب اختیار کرلیا۔ انگریزی حکومت نے جو اس وقت بمبئی میں تھی اسکی مہاراجگی تسلیم[2] کی۔ سیواجی نے کرناٹک کا رخ کیا۔ جنجی اور ویلور سے بیجاپوری فوجیں ہٹادیں۔ یہاں مختلف چھوٹے چھوٹے صوبہ جات خود سر ہو رہے تھے۔ شیرازہ انتظام ابتر تھا۔ اس کش مکش کے زمانہ میں شہزادہ محمد اعظم فرزند عالمگیرؒ کی شادی سکندر عادل کی بہن سے ہوئی۔ اس شہزادی نے بھائی کو جو خط لکھا ہے اس میں مرہٹوں کی وجہ سے بدنظمی ریاست پر زور دیا گیا ہے۔ علماء بیجاپور

---

[1] مہابلشور میں پرتاب گڑھ میں یہ واقعہ ہوا' وہیں اسکی قبر بھی ہے۔ مضمون کیشوراؤ مشیر دکن ۸ شوال ۱۳۴۲ھ۔ [2] یہ پہلا موقع ہے جبکہ ہماری تاریخ میں انگریزی حکومت کا نام آتا ہے۔ واسکوڈی گاما نے جو نیا بحری راستہ پیدا کیا اس سے تماشہ گاہ عالم میں ایک نیا منظر آغاز ہوا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بقول ڈریپر پرانی مسیحی سلطنتوں کے عوض نئی مسیحی سلطنتیں آناً فاناً تماشہ گاہ عالم میں حصہ لینے لگیں۔ اُن سب کا روئے مقصود ہندوستان تھا جسکی دولت کی داستانیں ضرب المثل تھیں۔ پرتگالی حکومت اگرچہ سواحل تک محدود تھی' لیکن اس سے فرزندان یورپ بھی ہندوستان کے ایک حصے کے مالک بنگئے۔ جس راستہ کو شراب پرتگالی نے کھولا تھا۔ اور جس سے وہ خود بھی مدہوش بنکر خود سب پر قبضہ کا خواب دیکھنے لگے تھے (البوکرک کا حملہ عرب پر)۔ بہت جلد ان کا نشہ اس طرح دور ہوگیا کہ دوسری تازہ دم قومیں بھی مستفید ہونیکی کوشش کرنے لگیں۔ ہالینڈ' ڈنمارک' انگلستان' فرانس۔ ان سب نے بحری مسابقت میں باہم آگے بڑھنے کی کوشش شروع کردی اگرچہ اسوقت ترکی بحری بیڑہ ان تمام قوموں کے بیڑے سے عظمت وشان میں بڑھا ہوا تھا۔ لیکن ترکوں کی فطرتی تجارتی بلکہ قاتت یا مسلمانوں کی نااتفاقی نے انکو اس میدان میں باوجود ہندوستان تک پہنچنے اور کامیابی حاصل کرنیکے کوئی کام نہ کرنے دیا۔ قصہ مختصر انگلستان کی حکومت اسوقت بمبئی اور مدراس میں موجود تھی۔

اور عالم گیر کے مکالمہ میں بھی مرہٹوں کے عروج کا رونا ہے۔ بیجا پور کے خاتمہ کا سین یہ ہے کہ ۲ ذیقعد ۱۰۹۷ھ کو شرزہ خاں مدار المہام ریاست بیجا پور خود میر شہاب الدین خاں المخاطب بہ غازی الدین خاں کمانڈ افسر توپخانہ عالمگیری کے پاس جاتا ہے۔ اور شہر کی سپردگی عمل میں آتی ہے اور انھیں غازی الدین خاں کی وساطت سے جن کی بدولت فتح بیجا پور انہی کے نام سے عالم گیر نے تسلیم کی ہے۔ وہ دربار عالمگیری میں باریاب ہوتا ہے۔ عالمگیر کی سواری بیجا پور میں داخل ہوتی ہے اور بیجا پور مغل امپائر کا ایک صوبہ بنجاتا ہے۔ سکندر کے گزارہ کیلئے معقول انتظام ہوتا ہے۔

الٰہی تا ابد تخت آصفی پائدار باد کہ ہم یادگار بیجا پور وہم یادگار عالمگیری است

فصلِ دوم

نظام شاہیہ احمد نگر

نظام شاہی خاندان برہمنی نو مسلم نسل سے تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ "میں نے نظام شاہی دولت خانہ کے معتبر برہمنوں سے سنا ہے کہ نظام شاہ کے اجداد پاتھری کے برہمنوں سے تھے اور کسی وجہ سے نقل مقام کرکے بیجا نگر چلے گئے تھے" سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے میں بمقام بیجا نگر "تیما بھٹ" گرفتار ہوا، جس کا بعد قبول اسلام ملک حسن نام رکھا گیا اور غلامان شاہی کے زمرے میں داخل ہوا۔ چونکہ نوشت وخواند سے واقف اور فن ہندسہ میں لیاقت رکھتا تھا، ہذا شہزادہ محمد کے ساتھ مکتب میں بھیجا گیا۔ بھرو مشہور تھا جو بحری ہوگیا۔ رفتہ رفتہ گاوان کی

حسنِ توجہ سے تیزی کرتے ہوئے "اشرف ہمایوں نظام الملک بحری" خطاب کے ساتھ طرفدارِ تلنگانہ کے درجہ پر فائز ہوا۔ اور گاواں کی شہادت کے بعد خود اسی کے عہدۂ مدار المہامی پر مامور اور "ملک نائب سر لشکر" کا خطاب حاصل کیا۔ اس نے اپنے بیٹے احمد کو جنیر بھیجا جو گویا مرہٹواڑی کا مستقر تھا۔ اور خود دربار میں رہا۔ محمد شاہ کے بعد محمود شاہ کے زمانہ میں جب نظام الملک بادشاہ کے ساتھ تلنگانہ کی مہم پر گیا تو اس معرکہ میں نظام الملک بھی مارا گیا۔ باپ کے مارے جانے کی خبر سن کر احمد جنیر میں "نظام الملک بحری" کے لقب سے خود مختار حاکم بن گیا لیکن "شاہی" کا لقب اختیار نہیں کیا۔ گو اسکی شہرت ہے۔ جو فوجیں منجانب دربار بیدر بھیجی گئیں ان کو نیکا پور کے قریب احمد نے شکست دی اور وہاں باغ نظام لگایا۔ یوسف عادل شاہ کی رہبری سے اس نے بھی بجز اس خود مختاری کے گریز نہیں پائی۔

آبادی احمد نگر | دولت آباد کی تسخیر کے خیال سے اس نے چند بار حملے کئے لیکن جب معلوم ہو گیا کہ قلعہ دولت آباد کی تسخیر اس طریقہ سے ناممکن سی ہے تو اس نے یہ تدبیر سوچی کہ جنیر دار الحکومت اور دولت آباد کے مابین ایک عارضی مستقر قرار دیا جائے۔ اس طرح دولت آباد کی نزدیکی کی وجہ سے اس امر کا موقع حاصل رہے گا کہ ہر سال غلہ وغیرہ فراہم کرنے کے زمانے میں حملہ کر کے رسد روک دینے کی کوشش کی جائے۔ اس طور سے قلعہ والے عاجز ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس خیال سے ۹۰۰ھ میں احمد نگر بسایا گیا جو دو تین سال میں اس قدر بارونق بن گیا کہ بقول فرشتہ بغداد و مصر کے ساتھ ہمسری کا دعوے کرنے لگا۔ آخر ملک اشرف قلعدار کے مرنے کے بعد دولت آباد بھی ہاتھ آگیا لیکن بخیال برکت احمد نگر ہی دار السلطنۃ رہا۔

احمد کا کیرکٹر | احمد میں بھی وہ اوصاف موجود تھے جو بانیٔ خاندان حکومت کیلئے درکار ہیں۔ بقول مولوی بشیر الدین احمد وہ رعایا پرور، خدا ترس اور عادل تھا۔ ساتھ ہی نہایت عفیف مزاج تھا جو شاہان

مشرق میں نہایت ندرت کی چیز کہنی چاہیئے۔ چنانچہ سواری کے وقت اِدھر اُدھر نظر نہیں ڈالتا تھا اس خیال سے کہ کسی نامحرم عورت پر نظر نہ پڑ جائے۔ قلعہ کاویل سے ایک لڑکی جو گرفتار ہو کر حرم میں داخل کی گئی، اس نے بعد دریافت اسکو اس کے شوہر کے حوالہ کر دیا۔ فوج سے اگر کوئی بھاگ جاتا تو اس سے سختی کا برتاؤ نہیں کرتا بلکہ نوازشات سے اسکو پھر واپس آنے کی ترغیب دیتا۔ سنی المذہب تھا۔ ۹۱۴ھ میں اس نے انتقال کیا اور خلد آباد کے روضہ میں دفن ہوا۔ جو اسکی عقیدت مندی کی دلیل ہے۔

یکلیک | احمد نظام شاہ کو شمشیر بازی کا بیحد شوق تھا۔ چنانچہ اسی شوق سے یکلیکی کا رواج دکن میں ہوا جو ڈویل کے مقابل ہے۔ چنانچہ خود اُسکے دربار میں روز دو تین آدمیوں کی جان جانے لگی۔ تازہ وارد فرشتہ کو اس شمشیر زنی کے خرافات نہایت زبوں معلوم ہوتے ہیں چنانچہ اس نے اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ تھوڑے وقت میں چھ آدمی جان سے مارے گئے بہرحال اس نے تسلیم کیا ہے کہ "فی الواقع مسلمانانِ دکن شمشیر بازی میں بے نظیر ہیں اور کوئی شخص جب تک کہ اس فن سے واقف نہو ان کا تلوار سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیر اندازی اور نیزہ بازی سے وہ عاری ہو گئے ہیں۔ اسی لئے میدان جنگ میں جبکہ فریق مخالف دوسری قوم ہو انکی خرابی آجاتی ہے۔" اُس کے زمانے میں اس کا رواج قانوناً مٹایا جا رہا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اسکو تلنگانہ میں ممنوع قرار دیا تھا۔

برہان نظام شاہ | باپ کے مرنے کے بعد برہان نظام شاہ کی عمر سات برس کی تھی مکمل خاں دکنی جو عاقل مدبر اور شجاع تھا، پیشوا اور میر جملہ قرار پایا۔ دوسرے امرا کی رقابت کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ موجود تھا۔ مکمل خاں نے برہان نظام شاہ کی تعلیم کا اچھا بندوبست کیا۔ چنانچہ دس سال کی عمر میں وہ کافیہ پڑھنے لگا۔ خط نسخ اچھا لکھتا تھا۔ مکمل خاں سے آخر اختیارات برہان نے خود اپنے ہاتھ

میں لے لئے اور کمل خاں اس دولت و اقتدار کے بعد خانہ نشین ہو گیا۔

فرقۂ مہدویہ اہلِ سنت والجماعت میں نویں صدی میں "مہدی" کا بیحد انتظار ہونے لگا تھا۔ مقتدایان ملت سمجھنے لگے تھے کہ ایک ہزار کے سنہ کے ساتھ دنیا کا بھی خاتمہ ہے۔ حالانکہ یہ صدی اسلامی عظمت کی صدی تھی۔ محمد ثانی نے قسطنطینیہ فتح کر لیا تھا۔ بہر حال انتظار مہدی جس بیتابی سے ہو رہا تھا، اور قیامت کا جو خیال پیدا ہو گیا تھا اُسکی بنا پر علامہ جلال الدین سیوطی کو اُن خیالات کی جو مقتدایان عصر کے قلم سے شایع ہوئے تھے تردید کی ضرورت ہوئی۔

بہرحال جس زمانے میں احمد نگر میں قلعہ اور باغِ نظام کی بناڈالی جا رہی تھی تو اس زمانہ میں شیخ سید محمد جون پوری پیشوائے فرقہ مہدویہ ہندوستان سے پھرتے ہوئے احمد نگر پہونچے تھے، احمد نظام الملک کو بیٹے کی آرزو تھی۔ وہ انکی خدمت میں حاضر ہوا۔ دعا کی برکت سے خدا نے برہان (ولی عہد) بیٹا دیا۔ سید محمد مجذوب صفت تھے۔ احمد نگر سے وہ بیدر گئے، وہاں سے گلبرگہ میں مزار حضرت سید محمد گیسو دراز کی زیارت کرتے ہوئے حج کو گئے اور بغیر زیارتِ مدینہ واپس آکر ۹۰۳ھ میں احمد آباد میں مہدویت کا دعویٰ کیا۔ علمائے عصر کی رائے غالب نے انکی مخالفت کی۔ بار بار خارج البلد کئے جاتے رہے تا آنکہ ہندوستان سے خراسان گئے تاکہ مہدی کے خراسان سے نکلنے کی جو روایت ہے اسکے مصداق بن جائیں[1] اور وہیں ۹۱۰ھ میں فرقہ مہدویہ کو یادگار چھوڑ کر انھوں نے انتقال کیا۔ اپنے مقتدیٰ کے بعد مثل اور فرقوں کے یہ فرقہ بھی نشوونما پاتا رہا۔ گجرات میں اس نے قوت پکڑی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگ شیخ سید محمد کے معتقد تھے۔ برہان نظام شاہ چونکہ خود پیشوائے فرقہ کے دعا کی بدولت پیدا ہوا تھا لہذا دربار احمد نگر میں اس جدید فرقہ کی آؤ بھگت ہوئی۔ بہرحال برہان ابتدا اِسی فرقہ کا معتقد تھا۔ چنانچہ اُس نے

---

[1] طرفہ ماجرا ہے کہ زمانہ حال میں اسکو ابو مسلم خراسانی کی سازش سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن عقیدت ایسی چیز ہے کہ صدیوں کے بعد بھی ہدایت کو آنکھوں سے لگاتی اور اس کا مصداق بننے کی کوشش کرتی ہے۔

خلفا و مریدین مثل شاہ نظام وولا ور نعمت وغیرہ کو گجرات سے طلب کرکے دربار میں جگہ دی اور
اپنی بیٹی انکے پوتے سید میراں جی بن حمید بن شیخ موصوف کے عقد نکاح میں دی[۱]۔
غرض "انتظار مہدی" ہی کی بدولت فرقہ مہدویہ ہندوستان میں قایم ہوگیا۔ لیکن احمد نگر میں
بہت جلد مہدویت کو شیعیت نے شکست دیدی۔

شاہ طاہر مصر میں ایوبی خاندان کی حکومت کے بعد اسمٰعیلیوں نے قزوین میں قدم جمائے
جو پہلے سے داعیان باطنیت کا مرکز تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ شاہ طاہر تک پہونچا جو نہایت عالم اور
فصیح البیان تھا۔ شیعہ مذہب کا حامی اور خانوادۂ مشیخت کا ہی ایک رکن تھا۔ خاندانِ صفویہ جب
ایران میں غالب ہوا تو اس نے اسمٰعیلیہ کو تباہ کرنا باغراض سیاست ضروری سمجھا۔ چنانچہ شاہ طاہر
نے حلقۂ مشیخت کو چھوڑ کر چند دن تک کاشان کی سرکاری مدرسی کی لیکن بالآخر بخوف حکومت بھاگ
کر گوا چلا آیا۔ وہاں سے اسمٰعیل عادل کے زمانے میں بیجاپور پہونچا۔ لیکن ابھی اسکے عروج کا زمانہ
نہیں آیا تھا۔ لہذا حج کے ارادہ سے بندرگاہ چپول گیا۔ وہاں سے حج و زیارت کے بعد کربلا و مشہد
کی زیارت کرکے پھر ہندوستان آیا۔ اب وہ پرینڈہ میں پہونچا جہاں کا قلعدار مخدوم خواجہ جہاں دکھنی
منجملہ امراء بہمنی اب نظام شاہی دربار کا متوسل تھا۔ اسکے لڑکوں کی تعلیم شاہ طاہر کے تفویض ہوئی۔ اتفاق
سے برہان نظام شاہ نے اپنے استاد پیر محمد شروانی کو بطور سفارت قلعدار پرینڈہ کے پاس بھیجا تھا۔ یہاں
اس نے شاہ طاہر سے مجسطی پڑھی۔ اب تمام دکن میں غلغلہ پڑ گیا کہ پرینڈہ ایک ایسے بزرگ کے وجود سے
منور ہے کہ پیر محمد سا استاد اسکی شاگردی کا افتخار حاصل کرتا ہے۔ اسی تقریب سے شاہ طاہر دربار
نظام شاہی میں پہونچا۔
اسی شاہ طاہر کی وجہ سے مہدوی فرقہ کی بجائے شیعیت کا یہاں بھی زور ہوا۔ شاہ طاہر اُن نامور

---

[۱] ماخوذ از ہدیہ مہدویہ

علماء سے ہے جنھوں نے عالمانہ قابلیت اور اقتدار سے میدان سیاست میں بھی بیحد کام کیا اور تاریخی شہرت حاصل کی ہے عادل شاہیہ اور نظام شاہیہ میں روابط خاندانی اسی کی بدولت قایم ہوئے۔ مگر جیسا کہ ہم نے عادل شاہیہ کے بیان میں ظاہر کیا ہے، ہر وقت پالسی بدلتی رہتی تھی۔ لہذا بیجاپور کو نیچا دکھانے کیلئے شاہ طاہر ہی کے مشورے سے برید شاہ اور عماد الملک سے اتحاد قایم کیا گیا[له]۔ لیکن جلد جلد پالسی بدلتی ہی رہی۔ نظام شاہ نے برید و نظام الملک کو شکست دی جسکی وجہ سے گجرات کے بہادر شاہ سے جسکی طاقت اس وقت نہایت قوی تھی۔ ان ریاستوں نے استمداد کی اس نے درخواست بخوشی منظور کی۔ اس زبردست حملہ سے بچنے کے لئے شاہ طاہر کے مشورہ سے بابر کی خدمت میں التماس کیا گیا، جو اس وقت ہندوستان میں مغلیہ حکومت قایم کر چکا تھا۔ نیز عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ سے بھی مدد کی درخواست کی گئی۔ بابر تو اس وقت کیا کر سکتا تھا قطب شاہیہ اس وقت کچھ سے لڑ رہے تھے۔ البتہ عادل شاہیہ نے مدد دی۔ لیکن بہادر شاہ کی طاقت غالب تھی۔ برہان پرینڈہ سے جنیر چلا آیا۔ اور بہادر شاہ احمد نگر میں بطور فاتح داخل ہوا۔ اس طرح اسقدر

له شاہ طاہر کا اثر نہ صرف میدانِ سیاست اور تعلقات سفارت میں نظر آتا ہے، بلکہ فوجی لائن بھی اسکی اعلےٰ قابلیت اور مشورے کی رہینِ منت رہی ہے۔ احمد نگر کا تفوق زیادہ تر اس کے بھاری توپخانہ کی وجہ سے تھا۔ اس توپ خانے نے رام راج کا کام پورا کیا تھا۔ توپ خانہ اگرچہ محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں ہندوستان میں قایم ہو چکا تھا۔ لیکن شاہ طاہر نے اس زمانے کی سب سے نامور توپخانہ رکھنے والی سلطنت یعنی ترکی سے براہ راست استفادہ کی ضرورت سمجھی۔ شاہ طاہر ہی نے ایک ترک کمانڈر کے ذریعہ سے احمد نگر میں توپ خانہ قایم کرایا۔ اسکے تفصیلی حالات ہم آئندہ لکھیں گے۔ یہاں صرف شاہ طاہر کی اعلیٰ قابلیتوں اور اسکی دوربینی کا اظہار مقصود ہے۔ بقول فرشتہ " فتح رام راج نیز بہ مساعی کوشش وسعی او بہ وقوع انجامید"۔ غرض شاہ طاہر کے اثرات اسکی زندگی سے زیادہ اس کے مرنے کے بعد ظاہر ہوئے۔

جلد اس اسلامی شہر نے دوسرے اسلامی فاتح کی صورت دیکھی۔ چونکہ نظام شاہی حکومت بھی ابھی باقی تھی۔ اسلئے اس نے رسد رسانی میں دقتیں پیدا کیں۔ اس طرح گویا گجراتی فوج کو قحط کا سامنا تھا۔ برہان نظام شاہ نے کانورسی کو جو شیخ جعفر سابق پیشوا (مدار المہام) کا برہمن[۱] (معتمد) تھا، پیشوا قرار دیا جو عقل و فراست، امانت و دیانت سے متصف تھا۔ برید اور مالوہ کے حکمرانوں نے جب دیکھا کہ شاہ گجرات بجائے اس کے کہ انکی خواہشونکو پورا کرے خود یہاں قبضہ جمانا چاہتا ہے تو انھوں نے اسکی امداد سے پہلو تہی کرنی شروع کی۔ بالآخر برہان نظام شاہ اور عماد شاہ نے سلطان بہادر گجراتی کے نام کا خطبہ پڑھے جانے کو منظور کر لیا، اسکے بعد صلح ہوگئی، اور بہادر شاہ گجرات چلا گیا۔ برہان نظام شاہ احمد نگر میں پھر اپنے جلوس کے ساتھ داخل ہوا۔ دوسرے سال شاہ طاہر سفیر بنکر گجرات میں گیا۔ اور اب اس کا اثر دربار گجرات میں بھی پھیل گیا۔ بہادر شاہ جب مندو کی حکومتِ خلجی پر غالب آکر برہانپور آیا تو اس نے برہان نظام شاہ کو بھی شاہ طاہر کی معرفت سے بلایا۔ ملاقات کے موقع پر کیا عملدرآمد رہے اسکی بڑی فکر برہان شاہ کو رہی۔ آخر شاہ طاہر نے قرآن مجید مکتوب حضرت علی رضی اللہ عنہ ساتھ رکھنے کی رائے دی اور اس طرح فرمانروائے غالب و مغلوب کی ملاقات اس طریقہ سے ہوئی کہ مغلوب کو زیادہ شکوہ نہ ہوا۔ بہرحال شاہ طاہر کی ڈپلومیسی سے ملاقات کا اختتام بخیر و عافیت خوشی کے ساتھ[۲] ہوا۔ خنجر اور شمشیر مرصع جو بہادر شاہ کی کمر پر تھے، اُس نے ان کو کمر سے کھول کر برہان نظام شاہ کی کمر پر باندھے۔ اور خطاب نظام شاہ کی مبارکباد ادا کی۔ چتر و آفتاب گیر سفید جو شاہان مندو سے چھینا گیا تھا برہان نظام شاہ کے جلوس میں دیا گیا۔ دوسرے روز چار طلائی کرسیاں تخت کے سامنے رکھی گئیں جن

---

[۱] گویا لفظ برہمن ہمیشہ معتمد کے مفہوم کو ادا کرتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عموماً دفتر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔

[۲] بہادر شاہ گجراتی نے برہان نظام شاہ سے اولاً گجراتی میں خطاب کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ملک میں مادری زبان گجراتی تھی۔ برہان نظام شاہ نے فارسی میں جواب دیا۔ غالباً وہ گجراتی سے ناواقف تھا۔ ۱۲

پر نظام شاہ، شاہ طاہر، میراں محمد شاہ، شیخ عارف ولد شیخ اولیا کی نشست تھی۔ غرض اس طرح شاہ طاہر کے ذریعہ سے برہان نظام شاہ کا مغلوب پہلو انجام کے لحاظ سے دکن کے افق پر جیسے کہ اس نے نظام شاہ کے خوب ذہن نشین کرا دیا تھا۔ بجائے خود غالب ہو گیا۔ مرہٹے راجہ جو احمد نظام شاہ کے وقت سے ابتک مطیع نہ ہوئے تھے۔ اب مطیع ہو گئے۔ تیس قلعے بغیر لڑائی کے ہاتھ لگے۔ سابا جی کو جو غالباً وزیر خزانہ تھا، پرتاب رائے، خطاب دیا گیا۔

مذہب تشیع سرکاری مذہب ۹۴۴ھ

اب شاہ طاہر کے مشورہ سے مذہب تشیع احمد نگر کا بھی شاہی مذہب قرار پایا۔ اور سبز رنگ اختیار کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بیجا پور میں ابراہیم عادل شاہ نے سنی مذہب عارضی طور سے جاری کر دیا تھا۔ اصول تدافع کا جلوہ نمایاں ہے۔ اس تبدیل مذہب کا واقعہ فرشتہ اس طرح لکھتا ہے کہ گجراتی واقعہ میں چونکہ شاہ طاہر کی سیاسی کاروانی سے کام انجام پذیر ہوا تھا، لہذا بادشاہ کے دل میں اسکی وقعت بڑھ گئی۔ قلعہ احمد نگر کے اندر جہاں اب جامع مسجد ہے، مجلس درسی (مدرسہ[1]) قایم کی گئی۔ جہاں شاہ طاہر ہفتہ میں دو بار علماء پائے تخت کو درس (لکچر) دیا کرتا۔ اس طرح ایک بہت عظیم الشان علمی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ مباحثہ بھی ہوتا۔ برہان نظام شاہ خود بھی اس میں حاضر ہوا کرتا۔ اس اسمٰعیلی اثر سے فرقہ مہدویہ کا زور گھٹ گیا۔ اور اس کے پیرو احمد نگر سے خارج کر دئے گئے۔ اس وقت تک شاہ طاہر سنیت کا ادعا کرتا رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ پرینڈہ اور گجرات میں روشناس ہوا تھا۔ اسی بنا پر ملا پیر محمد نے اسکی شاگردی اختیار کی۔ ملا پیر محمد سنی المذہب تھا۔ اب ایک موقع ایسا آگیا کہ شاہ طاہر کو اپنے حقیقی مذہب کے افشا کرنے کا موقع مل گیا۔ شہزادہ عبد القادر تپ محرقہ سے سخت بیمار ہو گیا۔ قاسم بیگ حکیم سرکاری اور دیگر اطبا مسلمان اور ہندو علاج

---

[1] شاہ طاہر کے مدرسہ کے مقام پر حسین نظام شاہ نے اپنے زمانہ میں مسجد کی بنا ڈالی جو گچ اور پتھر سے تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد مرتضیٰ نظام شاہ کے ابتدائی زمانہ میں زیر نگرانی قاضی بیگ طہرانی انجام پذیر ہوئی گویا احمد نگر میں بھی ایرانی تعمیرات کا اثر تھا۔۱۲

سے عاجز آ گئے تھے۔ حتیٰ کہ پنڈتوں سے مندروں میں کار برآری کی دعائیں ہونے لگیں۔ ایسے وقت میں شاہ طاہر نے اپنے اثر سے مذہب اثنا عشری قبول کروالیا۔

بادشاہ کی اجازت سے (۴) مذاہب کے علماء کی مجلس مباحثہ قایم ہوئی۔ ملا پیر محمد، افضل خاں، ملا داؤ و دہلوی وغیرہ علمائے مذاہب اربعہ جو احمد نگر میں جمع تھے باہم بحث کرنے لگے۔ چھ مہینہ تک یہ سلسلہ رہا۔ اس کے بعد شاہ طاہر کے اشارے سے شیخ احمد نجفی بھی جو شیعہ تھے بڑے تجسس کے بعد طلب کئے گئے۔ طاہر نے انکی طرفداری شروع کی۔ اس سے اب یہ عقدہ حل ہونے لگا کہ طاہر بھی شیعی ہے اور اس طرح اب خود طاہر خصم بن گیا۔ اس نے بتدریج "قرطاس" و "فدک" کے مباحث پر گفتگو کی اور اسی ضمن میں صحت شہزادہ اور خواب کا قصہ بھی پیش کیا گیا۔ غرض بادشاہ وغیرہ تین ہزار اشخاص نے مذہب اثنا عشری اختیار کر لیا۔ خطبہ میں بھی ائمہ اثنا عشری کا نام لیا جانے لگا۔ خلفاء ثلاثہ کے نام خارج کر دئے گئے۔ چتر سفید کا رنگ بھی سبز کر دیا گیا۔ ملا پیر محمد وغیرہ کے زیر اثر عوام میں اس سے شورش پیدا ہوئی۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ چونکہ شاہ طاہر علوم عربیہ سے باخبر ہے۔ لہذا اس نے برہان شاہ کو گمراہ کر دیا۔ اور علماء پر گویا افسوں پڑھ کر اُن کی زبان بند کر دی۔ بہر حال بارہ ہزار کے مجمع نے مظاہرہ کیا لیکن اُسکو منتشر کر دیا گیا۔ ملا پیر محمد گرفتار کر لیا گیا، اور شاہ طاہر کی عالی ظرفی سے اسکی جان بخشی ہوئی۔ شاہ طاہر نے ایران سے شیعہ مذہب کے لوگ بلوائے اور انکو دربار میں اقتدار دلایا۔ اس تبدیل مذہب سے سنی روساءش سلطان محمود گجراتی اور میراں مبارک شاہ فاروقی، ابراہیم عادل شاہ، عماد الملک نے احمد نگر پر حملہ کی تیاری کی۔ لیکن برہان نظام شاہ نے ڈپلومیسی سے گجرات اور برہان پور کو ملا لیا اور عادل شاہیہ سے مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کی۔ بہر حال ہمعصر روساء میں نظام شاہ کا پلہ بھاری تھا۔

۹۵۶ھ میں شاہ طاہر کا انتقال ہوا۔ اس کا اثر بیدر اور گولکنڈہ میں بھی تھا۔ جمشید قلی قطب شاہ

بھی اس کا مرید ہو گیا۔ فرشتہ نے طاہر کے تصانیف کی فہرست بھی بیان کی ہے۔ طاہر کے بعد برہان شاہ کے پاس قاسم بیگ حکیم اور گوپال راؤ کا رسوخ ہوا۔ بولا رائے برہمن بھی اس کا ایک اعلیٰ عہدہ دار ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس زمانہ توازن قوا میں مذہبی جامعہ کا لحاظ نہ رہا تھا۔ برہان نظام شاہ نے عادل شاہیہ کو زک دینے کے لئے رام راج سے عہد و پیمان کیا تھا۔ اور اُسکے ساتھ مل کر عادل شاہیہ سے لڑائیاں ہوئی ہیں۔

۴۷ سال کی حکومت کے بعد ۹۶۱ھ میں برہان نظام شاہ مر گیا اور اپنے باپ کے پاس خلد آباد میں دفن ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نعش کربلا بھیجی گئی۔

حسین نظام شاہ | باپ کے مرتے ہی بیٹوں میں نزاع برپا ہوئی۔ قاسم بیگ حکیم حسین کا طرفدار تھا۔ اور اسی کی تائید سے حسین تخت نشین ہوا۔ یہ ایک جنگجو تند مزاج شخص تھا۔ اس کو چنداں علمی دلچسپی بھی نہ تھی۔ علمی دلچسپیاں بیجاپور میں تھیں جہاں علم و حکمت کا دریا بہہ رہا تھا۔ مصطفیٰ خاں اردستانی نے جسکے حالات بہ ضمن عادل شاہیہ بیان ہو چکے ہیں قطب شاہ سے حسین کا کیرکٹر اس طرح بیان کیا ہے کہ "حسین قہار و بے اعتدال و عہد شکن است"۔ متعدد نامور امرا اس نے مروا ڈالے۔ اسی کے زمانے میں ابراہیم عادل شاہ مر گیا اور اب پھر ڈپلومیسی کے نئے نئے رنگ بدلنے لگے جس کی تفصیل لاحاصل ہے۔

رام راج کی عظمت | لیکن اس تمام منازعت کا نتیجہ تھا کہ رام راج کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ بوقت ملاقات رام راج نے حسین نظام شاہ کی تعظیم نہیں کی اور غالباً اسی کا بدلہ اس نے رام راج کے حکم قتل سے لیا۔ یہی وجہ تھی کہ علی عادل شاہ نے ان باہم دست و گریبان ریاستوں کو ایک دفعہ متحدہ فوج کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ جن میں تین اب شیعیت میں بھی متحد تھیں اور ان میں اعلیٰ جنگی اقتدار اسی احمد نگر کے توپخانہ والے حسین کا تھا۔ بیجانگر کے آنسو ابھی خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ سپہ سالار افواج متحدہ

حسین نظام شاہ بھی اپنی بری معاشرت سے جوانی میں بوڑھے رام راج کا ساتھ دیکر اس حیرتکدۂ عالم سے اٹھ گیا جسکے اسرار سچ تو یہ ہے کہ "کس نہ کشود و نہ کشاید"۔

مرتضیٰ نظام شاہ دیوانہ ابتداً مرتضیٰ کی ماں خونزہ ہمایوں نے ریجنسی قایم کی جو آذربائیجان کے قراقونیلو بادشاہ کی نسل سے تھی۔ پردے کے پیچھے اسکی نشست رہتی۔ ملا عنایت اللہ پیشوا اور حکیم قاسم بیگ کے استصواب سے تمام کاروبار چلتے تھے۔ اس ماں سے چاندبی بی کا نام روشن ہوا۔

خونزہ ہمایوں نے چونکہ اپنے ہی رشتہ داروں کے ہاتھ میں تمام ملک دیدیا تھا لہذا اس کی مخالف پارٹی قایم ہوگئی۔ جس نے بیٹے کو ماں سے جدا کردیا۔ قاسم بیگ گجرات چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے چلتے ہوئے اپنی عمر بھر کی کمائی شاہ رفیع الدین فرزند شاہ طاہر کے پاس امانت رکھوادی تھی، گجرات پہونچ کر واپس طلب کی لیکن ایک تھیلی بھی اندر نہ پائی۔ اس غم کے مارے وہ مرگیا۔ مرتضیٰ نے آخر ماں اور ماموؤں کو حکومت سے علیحدہ کردیا۔

مرتضیٰ کے نام کے ساتھ "دیوانہ" جزو لاینفک بنگیا ہے۔ خوش قسمتی سے وقتاً فوقتاً اس کو ایسے لایق وزرا ہاتھ آگئے جن سے ریاست قایم رہی۔

پرتگالیوں سے مٹ بھیڑ احمدنگر والوں کی بھی پرتگالیوں سے سواحل ہند پر مٹ بھیڑ وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔ اولاً خود حسین نظام شاہ کے زمانہ میں ۹۶۵ھ میں مولانا شاہ محمد استاد نیشاپوری اور چلپی رومی خاں کی مہم قلعہ ریگ ڈنڈہ پر جو جیول کے قریب ہے بھیجی گئی تھی۔ جہاں نصاریٰ فرنگ مسلمانوں کو تشویش کررہے تھے۔ عیسائیوں نے اس وقت عہد کیا کہ وہ مسلمانوں کی مزاحمت نکریں گے لیکن پھر ان کا دست تعدی دراز ہوگیا۔ فوج جو بھیجی گئی اس نے دو سال تک محاصرہ رکھا۔ احمدنگر کا نامور توپخانہ گویا اب اسقدر جلد اسقدر ناکارہ ہوگیا تھا کہ پرتگالیوں کو عاجز نہ کرسکا۔" امرائے نظام شاہی نئی از ذرہ جنس رشوت گرفتہ............شراب پرتگالی معہ سائر مایحتاج وقت شب فرستادند۔"

دو آدمی جو اتفاق سے کسی جہاز میں آگئے وہ خواجہ میرک کے ذریعہ سے مرتضیٰ کے پاس پہونچے اور حقیقت حال عرض کی۔ بالآخر محاصرہ اٹھالیا گیا۔ امرائے سابق معزول کئے گئے۔ خواجہ میرک چنگیز خاں کے خطاب سے وکیل السلطنت قرار دیا گیا۔ بقول فرشتہ "چنگیز خاں کہ باصابت رائے متصف بود از عہدہ منصب وکالت کماینبغی برآمدہ بلدہ احمد نگر را رشک بوستان ارم گردانید"۔ اس نے عادل شاہیہ سے اتحاد قایم رکھا۔

اب اکبر کا زمانہ آگیا تھا۔ برار کی حکومت کا خاتمہ نظام شاہیہ نے کر دیا چنانچہ "فاتح ملک برار" تاریخ فتح ہے۔ جملہ برار کے رؤسائے ریاست مع تفال خاں متغلب جس نے برہان عماد الملک کو قید کر رکھا تھا، نظام شاہ کے قیدی ہو گئے۔ یہاں سے مرتضیٰ نے بیدر کا رخ کیا تھا کہ فاروقیوں نے حملہ کر دیا مرتضیٰ نظام شاہ کا کیرکٹر بھی علی عادل شاہ کی طرح امرد پرستی سے خراب ہے۔ افسوس ہے کہ خواجہ میرک بھی جو نظام شاہی سلطنت کے لئے محمود گاواں تھا، مرتضیٰ نظام کے شربت زہر سے دنیا سے چل بسا اس واقعہ کے بعد بالآخر مرتضیٰ پشیمان ہوکر گوشہ نشین بن گیا۔ قاضی بیگ کو مدار المہام قرار دیا گیا۔ بادشاہ سلامت صرف عرضداشتوں پر شرح کر دیا کرتے تھے۔ سولہ برس کا زمانہ اس طرح گزرا۔ غریبوں اور دکنیوں کا جھگڑا تازہ ہوا۔ صاحب خاں ملازم بادشاہ نے ظلم و ستم ڈھائے۔ غرض ایک بڑا جھگڑا ہوا جس میں دکنی پارٹی نے کامیابی حاصل کی۔ غریب پارٹی کے سربرآوردہ رؤسا بیجاپور چلے گئے۔ انکی عورتوں وغیرہ پر ظلم و ستم کیا گیا۔ اس سلسلہ منازعت میں صاحب خاں کی فرط محبت سے ایسے ایسے حرکات مرتضیٰ نظام شاہ سے سرزد ہوئے کہ انکی نسبت بجز اسکے کیا کہا جاسکتا ہے کہ اگر اب کوئی بادشاہ ایسے حرکات کرے تو فوراً دار المجانین میں بھیجدیا جائے۔ بالآخر صاحب خاں خداوند خاں کے ہاتھ سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اب صلابت خاں مدار المہام ہوا۔ اکبر کے سفرا بار بار احمد نگر آنے لگے "درعہد صلابت خاں امنیت وضبط بہ مرتبہ کمال رسیدہ تجار وغیرہ بہ فراغت تردد می کردند وبعد از

سلطان محمد بن علاء الدین حسن بہمنی در ولایت مرہٹ ہیچ کس مثل صلابت خاں امنیت وضبط را به مرتبہ کمال نہ رسانیدہ۔"

جب علی عادل شاہ سے تختِ بیجاپور خالی ہوگیا تو صلابت خاں نے بیجاپور پر حملے شروع کردئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ادھر اکبری رول کی لہر دن بدن آگے بڑھ رہی تھی۔ دیوانہ بادشاہ نے صلابت خاں کو قید کرادیا اور خود اپنے بیٹے کو سوتے میں آگ لگادی جو اسکی خواص کی ہمدردی کی بدولت بچ نکلا۔ پھر بیٹے میراں حسین نے باپ مرتضیٰ کے ساتھ اس سے زیادہ اشد برتاؤ کیا اور خود تخت پر متمکن ہوا۔ لیکن بیٹا باپ سے بھی بدتر تھا۔ چندہی مہینوں میں مارا گیا۔ دکنیوں اور غیر ہونگی پارٹی فیلنگ دربار کے ٹکڑے ٹکڑے کررہی تھی۔ امن وامان غائب ہورہا تھا۔ اس کے بعد اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ تخت نشین بنایا گیا۔ مرہٹے ابھر رہے تھے۔ اس افراتفری میں اسمٰعیل کا باپ برہان خود تخت پر آ متمکن ہوا۔ لیکن دل ودماغ کچھ بھی نہ رکھتا تھا۔ اس کے خراب کیرکٹر سے امراء بددل تھے اور اسلئے پرتگالیوں کے مقابلہ میں انھوں نے عمداً جی چرایا جس سے سخت زک پھونچی۔ اسمٰعیل کے زمانہ میں مہدویہ مذہب کا پھر عروج ہوا تھا۔ برہان نے پھر تشیع کا بول بالا کیا۔

ملک عنبر | اس افراتفری کے زمانے میں عنبر حبشی غلام کا نام آتا ہے۔ اس کا نام اِس امر کی روشن دلیل ہے کہ اسلام کے جذاب اور ہمہ گیر دامن تمدن میں عرب وترک مغل اور آرین وایرانی ہی رنگے نہیں گئے۔ بلکہ سیاہ فام حبشی بھی اس نور سے یکساں مستفیض ہوئے۔ اور اگر کوشش کیجائے تو ایک حبشی بھی اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت پیدا کرسکتا ہے۔ عنبر ابتداً بیجاپور میں ملازم تھا۔ وہاں سے چند جرار حبشیوں کے ساتھ مرتضیٰ نظام شاہ کے دربار سے تعلق پیدا کیا۔ رفتہ رفتہ اپنی قابلیت کے زور پر اپنا اقتدار بڑھاتا گیا تا آنکہ وزیر اعظم ہوگیا۔ اس کا حریف راجو دکنی تھا دونوں آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ملک عنبر کی فوجی کارگزاری کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ حبشی باڈی گارڈ ہر زمانہ میں شاہانِ ہند

کے ساتھ رہا ہے۔ تعجب کے قابل اس کی اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت ہے۔ اس کی انتظامی قابلیت صرف نظم ونسق ملک میں ہی نظر نہیں آتی بلکہ اس سے زیادہ اسکی قابلیت رفاہ عام اور بہبودی وآبادی ملک کی کوششوں میں نظر آتی ہے۔ اورنگ آباد اُس کا ہی بسایا[۱] ہوا ہے۔ عنبر کے بیسیوں کارنامے رفاہِ عام کے تعلق سے یادگار ہیں۔ قطع نظر مساجد کے اورنگ آباد کی یادگار نہر بھی اُس کا کارنامہ ہے، جو اس زمانہ کے سررشتہ آبرسانی کا بہترین کارنامہ ہے۔ عنبر نے بندوبست و انتظام مالگزاری کی از سرنو تجدید کی وہ بھی ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ محسن الملک مرحوم نے سول سروس کمیشن کے روبرو نہایت پرزور الفاظ میں عنبر کی مثال دے کر بتایا ہے کہ بشرط کوشش مادرِ ہند کی گود میں بہترین منتظم افراد پیدا ہوسکتے ہیں۔ اعلیٰ ترین دماغی اوصاف کے ساتھ اس کا کیرکٹر بھی بے داغ ہے۔ اسّی سال کی عمر میں ۱۰۳۵ھ میں اس نے انتقال کیا۔ یہ بھی خلد آباد میں دفن ہے۔

نظام شاہیہ کا خاتمہ اب دربار کی حالت ہر روز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اور ادھر سلطنت تیموری شمالی ہند میں قوی تر ہوتی گئی۔ اور جب مالوہ، خاندیس اور برار مغلیہ امپائر میں شامل ہوگئے تو لامحالہ احمد نگر کی بھی باری آئی۔ اسباب بھی خود بخود مہیا ہونے لگے۔ برہان اپنے بڑے بھائی مرتضیٰ سے نالاں ہو کر اکبر کے دربار میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ چاند بی بی کا نام تاریخ میں یادگار ہے، جس نے مغلیہ فوج کی مدافعت کی لیکن طاقت اور خوش نظمی کے مقابلہ میں محض جوش بدنظمی کو فرد نہیں کرسکتا۔ چاند بی بی کا ایک حبشی نے کام تمام کر دیا۔ آخر احمد نگر مغلیہ امپائر میں داخل ہوگیا۔ احمد نگر کا دربار وہاں سے اٹھ کر دولت آباد اور فتح آباد[۲] میں آگیا۔ لیکن جس طرح عالمگیرؒ کو گولکنڈہ اور

---

[۱] اورنگ آباد کو اس نے اس طور سے آباد کیا جس طرح قطب شاہیہ نے حیدرآباد کو لحاظ ضرورت آباد کیا۔ عنبر دولت آباد سے اکثر اورنگ آباد آتا رہتا اسطرح اسکی آبادی زیادہ ہوگئی۔ [۲] اورنگ آباد۔ ۱۲

بیجاپور لیناضروری تھا اسی طرح اکبر کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ احمدنگر کو اپنی شہنشاہی میں شامل کرلے۔ اکبر نے بذات خود اسکے لئے توجہ کی۔ ابوالفضل میدانِ جنگ میں بطور سپاہی کے نظر آتا ہے۔ مغلیہ زور بڑھتی جاتی ہے۔ اکبر کے بعد جہانگیر کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اب خانخاناں سپہ سالار دربار مغل قرار پاتا ہے۔ اس نے ذمہ لیا کہ دو سال میں نظام شاہی قلمرو کو مغلیہ امپائر میں داخل کردیگا۔ لیکن جب تک عنبر زندہ رہا مغلیہ کوششیں بارور نہ ہوئیں ۱۰۳۶ھ میں جہانگیر بھی مرگیا۔ اب شاہجہاں کا زمانہ آیا جو دکن کا صوبہ دار رہ چکا تھا۔ اب دولت آباد فتح ہوگیا۔ ملک عنبر کے بیٹے کو دو لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا، اور کم عمر حسین نظام شاہ قلعہ گوالیار میں محبوس کردیا گیا۔ اس طرح دربار نظام شاہیہ بھی ختم ہوگیا احمدنگر کی اس مختصر تاریخ سے معلوم ہوگا کہ شاہ طاہر ہی کا اثر تھا جسکی بدولت برہان اور حسین نظام شاہ کا زمانہ کامیاب رہا۔ انکے بعد شاہی خاندان میں عالی درجے افراد کا وجود بند ہوگیا اور سخت خانہ جنگی ہوتی رہی۔ افسوس ہے کہ اسلام کی تعلیم کے برخلاف مسلمانوں کی معاشرت اور اصول زندگی کسقدر قابل ملامت تھے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا چاہئے تھا وہ ہوا۔ وہ مذہب جو دنیا میں مساوات اور حریت کی تعلیم دینے کیلئے آیا تھا، اسکے پیرو قدیم شاہان روم وایران کی تقلید میں ظالم اور بے دین بن گئے اور اس طرح اسلام کی مبارک تعلیم کو ان سے سخت صدمہ پہونچا۔ اس حالت میں غیر مسلم قوموں کا گلہ ان بادشاہوں اور حکمرانوں سے بے جا ہے جو خود اپنے بھائی بندوں پر ہر قسم کی دست درازی ایک معمولی کام سمجھتے تھے۔



فصل سوم

عماد شاہیہ و بریدشاہیہ

عماد شاہیہ | برار میں جو حکومت قایم ہوئی وہ بھی ایک نو مسلم نسل سے تھی۔ عماد الملک بھی دوسروں کی طرح بتدریج ترقی پاکر برار کا سپہ سالار ہوا تھا۔ بالآخر خود مختار ہو گیا (۸۹۴ھ) اسکے بیٹے علاء الدین عماد شاہ نے "شاہ" کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بڑے بیٹے نے اپنی لڑکی حسین نظام شاہ کے بیاہ میں دی۔ برہان عماد شاہ جو اس کے بعد تخت نشین ہوا کمسن تھا۔ تفال خاں اُس پر غالب آگیا اور اسکو قید کر دیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے زمانہ میں یہ ریاست احمد نگر میں ضم ہوگئی۔

برار نے بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کا سا نام پیدا نہیں کیا۔

بریدشاہیہ | یہ خاص صوبہ بیدر کا ترکی یا گرجی النسل حکمراں خاندان ہے۔ قاسم برید بھی بچپن میں محمد شاہ کے زمانے میں ایران سے لایا گیا۔ اس نے بھی جلد اپنی قابلیت ثابت کرنی شروع کروی۔ اس نے ایک مرہٹہ لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس تقریب سے اس خاندان کے چار سو آدمی حلقہ بگوشانِ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ انکی طاقت سے بھی محمود شاہ بہمنی کے زمانہ میں اسکو مزید قوت حاصل ہوئی۔ بہرحال قاسم میدان سیاست کا مہرہ بن گیا۔ خواجہ جہاں محمود گاواں کے قتل کی سازش میں اسکی بھی شرکت کہی جاتی ہے۔ غرض دربار بہمنی میں اُس کا بڑا رسوخ تھا۔ یوسف اور احمد جب دور نکل گئے تو اس کا اقتدار اور بھی زیادہ ہوا۔ بالآخر وزیر اعظم ہو گیا۔ اور رفتار زمانہ کے لحاظ سے جب بیجاپور اور احمد نگر میں خود مختار حکومت ہوگئی تو اس نے دربار بیدر اپنے

اقتدار میں کرلیا۔ ۹۱۰ھ میں وہ مرا۔ اسکے بعد امیر برید جانشین ہوا۔ عادل شاہیہ وغیرہ سے ہمیشہ اسکی مٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ بہر حال اس وقت بیدر بہمنی خاندان ہی کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ امیر برید اپنے قلعہ جات اودگیر، قندھار اور اوسہ میں رہا کرتا۔ کبھی کبھی بیدر آتا۔ جس طرح عباسیہ خاندان میں برائے نام خلافت تھی اسی طرح امیر برید خاندان بہمنیہ کے کسی شاہزادہ کو تخت نشین بنا دیتا۔ کلیم اللہ بہمنی کے احمد نگر میں مرنے کے بعد ۹۳۴ھ میں امیر برید بیدر کا مستقل فرماں روا بنا اور یہیں آکر بس گیا۔

عادل شاہیہ و نظام شاہیہ کے متفقہ حملہ میں امیر برید ہار مان گیا اور بیدر اس نے عادل شاہ کے حوالہ کر دیا اور خود اودگیر چلا گیا۔ دولت آباد کے متصل ۹۴۸ھ میں وہ مرا جہاں اسکا عظیم الشان مقبرہ موجود ہے۔

علی برید | اسکے بعد علی برید آیا اور یہی گویا بریدیوں کا گل سرسبد ہے۔ لفظ شاہ اس نے اپنے خطاب میں اضافہ کیا۔ (۳۸) برس کی حکومت کے بعد حدت ادویہ باہیہ سے ۹۸۷ھ میں انتقال ہوگیا۔ شاہ طاہر اسکی تہنیت جلوس کیلئے آیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علی برید اپنے معتقدات میں سخت تھا اسلئے شاہ طاہر کی یہاں زیادہ آؤبھگت نہ ہوئی۔

بریدیہ کا خاتمہ | علی برید کے بعد اس کے دو بیٹے ابراہیم برید اور قاسم برید علی الترتیب سات اور چار سال کی حکومت کرکے مرے۔ علی برید ثانی نے بارہ سال حکومت کی۔ اس ۲۳ سال کی مدت میں بیدر کا وجود صرف اس سے باقی رہا تھا کہ دوسری ریاستیں باہم اصول توازن پر عمل کرتی رہتی تھیں۔ تاہم بیدر کا تمدن چونکہ پہلے ہی کمزور ہو گیا تھا۔ لہذا اس میں سب سے پہلے موت طبعی کے آثار پیدا ہوئے۔ علی برید ثانی صرف آٹھ ضلع کا حکمراں تھا جن کا محاصل لا اله الا الله روپیہ سالانہ ہوتا تھا۔ ۱۰۱۸ھ میں وہ مرا۔ بہر حال علی برید کے دم تک حکومت دم رہا۔ اسکے بعد اسکا

بیٹا امیر برید ثانی بالکل عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ ۱۰۱۸ھ میں مرزا علی نامی ایک امیر تخت پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ نے حیدرآباد میں جا کر پناہ لی اور وہیں مرا۔ آخر عادل شاہیہ کا بیدر پر قبضہ ہو گیا۔ اور بریدیوں کا خاتمہ ہو گیا۔

فصل چہارم

قطب شاہیہ

بیجاپور و احمد نگر کے زیادہ پرشان و شوکت مگر ساتھ ہی بلحاظ موقع زیادہ پرخطر تمدن کے مرکزوں سے اب ہم سب کے آخر گولکنڈہ میں آتے ہیں جو اگرچہ شوکت و عظمت میں بیجاپور و احمد نگر سے کم تھا۔ لیکن بلحاظ موقع زیادہ اطمینان بخش اور با امن حالت میں تھا اور جہاں ہر وقت تبدیلی کا خطرہ کم تھا۔ تلنگانہ کا مقام ہی ایسا تھا جہاں دوسری اسلامی حکومتوں کی زد بہت کم تھی۔ آس پاس ایسی ہندو ریاستیں تھیں جو اپنے خانگی نزاعوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے دنیا کے عام نقشے سے بے تعلق تھیں۔ حسن اتفاق سے اس صوبے کی حکومت محمد قلی قطب الملک کے حصہ میں آئی۔ یہ بہارلو ترک نسل سے تھا۔ ہمدان میں پیدا ہوا، اور تازہ وارد روزگار آزماؤں کی طرح یہ بھی محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیس سال کی عمر میں اپنے چچا کے ساتھ عراقی گھوڑے لیکر باغراض تجارت بیدر میں آیا۔ یہاں آکر محمد شاہ کے ترک غلاموں کے زمرہ میں شامل ہوا۔ چونکہ حساب کتاب میں اچھا ماہر تھا اور خط سیاق اچھا لکھتا تھا لہذا ترقی پانے لگا۔ محلات شاہی میں اسکی کارگزاری اور دیانت داری کا شہرہ ہو گیا۔ محلات مبارک کی کسی جاگیر واقع تلنگانہ سے خبر آئی کہ وہاں ڈاکوؤں کا بہت

زور ہو گیا ہے۔ محمد شاہ کسی اعلیٰ افسر کو اسکے انتظام کے لئے بھیجنا چاہتا تھا۔ محمد قلی نے محلاتِ مبارک کے وساطت سے درخواست گزرانی کہ اگر اُس کو بھیجا جائے تو وہ اس مہم کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ اسکی درخواست منظور ہوئی۔ اس نے مقامی معتبر[۵] لوگوں کو ہموار کر کے انکے ذریعے سے کام ٹھیک کر دیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ وہ یہ اصول خوب سمجھا کہ باشندگانِ ملک کو ہی واسطہ بنا کر اُن سے ہی کام لیا جائے، جیسا کہ مغربی قوموں نے کیا ہے۔ غرض اس طرح ترقی کرتے ہوئے محمود شاہ کے زمانے میں "قطب الملک" بن گیا۔ گولکنڈہ معہ مضافات اسکی جاگیر قرار پایا اور پھر وہ اس علاقہ کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ قطب الملک اُس زمانے کے عام اصول کے مطابق صرف انتظامی قابلیت ہی نہیں رکھتا تھا، بلکہ جنگ آزما اور مرد میدان بھی تھا۔ چنانچہ شاہی فرمانوں میں اس کو "صاحب السیف والقلم" لکھا جاتا تھا۔ جب یوسف عادل، احمد نظام الملک، عماد الملک نے استقلال کا جھنڈا اوڑایا اور یوسف عادل نے مذہب تشیع کا اعلان کیا تو اسکی تقلید قطب الملک کو بھی کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ۹۱۸ھ میں اس نے بھی اپنی خود مختاری قایم کر لی۔ "قطب شاہ" لقب اختیار کیا۔ گولکنڈہ کو اپنا مستقر بنایا قلعہ کو مستحکم کیا۔ ضروری کئی عمارتیں بنائیں۔ ہر چیز میں شاہانِ ولایت (ایران) کے طرز اور قاعدہ کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اگرچہ اس کی ریاست مختصر تھی۔ لیکن شاہی تزک و شان زیادہ تھی۔ چنانچہ برخلاف عادل، عماد، برید کے شاہانِ ولایت کے طریقہ پر پانچ دفعہ نوبت جاری کی۔ اپنے رشتہ داروں اور قوم کے لوگوں کو حسب لیاقت عہدے عطا کئے۔ اس شان و تزک کے خیال کے ساتھ محمود شاہ آقا نعمت کے حقوق خدمت بھی کسی طرح فراموش نہیں کئے۔ ہمیشہ اُس کے پیشگاہ میں نقدِ معینہ، رقم ماہانہ نیز وقتاً فوقتاً تحفے اور ہدیے پیش کش کرتے رہتا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کے جلوس کے بعد اس کا نام خطبے میں

---

[۵] "بومیہ معتبر"۔ اس سے وطن دار شل پٹیل پٹواری۔ دیسکھ وغیرہ مراد ہیں۔

لیا جانے لگا۔ انکا تعلق دربار ایران سے مسلسل ازابتدا تا انتہا جاری رہا۔

اسکی حکومت کا بڑا زمانہ قرب وجوار کے راجاؤں کے جو خود سر ہونا چاہتے تھے زیر فرمان رکھنے میں صرف ہوا۔ ستر قلعے اس نے اپنی قلمرو میں شامل کئے۔ بیجاپور و احمد نگر وغیرہ کے جھگڑوں میں قطب الملک گویا اکثر نیوٹرل پالسی رکھتا۔ بہادر شاہ گجرات کے حملہ کے بعد اسمٰعیل اور برہان دونوں نے مل کر قطب الملک کا رخ کیا۔ اس متفقہ حملہ کی مدافعت کی اس کو طاقت نہ تھی، لیکن خوبی قسمت سے اسمٰعیل اس اثنا میں گولکنڈہ کے ارمان لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد شاہ طاہر کی کوشش سے دونوں درباروں میں اچھے تعلقات قایم ہو گئے۔ نو دبرس کی گویا عمر طبعی کو پہونچنے کے بعد اس طوالت عمر سے تنگ آکر اس کے بیٹے جمشید نے اسکو جامع گولکنڈہ میں سجدے کی حالت میں اصلی آرامگاہ میں پہونچا دیا (۹۵۰ھ)۔

جمشید اس کی تخت نشینی کے وقت شاہ طاہر بطور سفیر احمد نگر، گولکنڈہ میں آیا۔ اور اب پہلے سے زیادہ دوستانہ تعلقات احمد نگر کے ساتھ قایم ہوئے۔ برید کی طرفداری کر کے اسکو عادل شاہیہ کی قید سے چھڑایا جس کے صلہ میں علاوہ بیش بہا جواہرات کے قلعہ ہائے میدک حسن آباد، نارائن کھیڑہ کا قطب شاہی قلمرو میں اضافہ ہوا۔ نظام شاہیہ کے ساتھ ہو کر بیجاپور کے ساتھ اس نے لڑائی چھیڑی۔ دونوں اصل فریقوں میں صلح ہو گئی، اور نظام شاہ بلا اطلاع جمشید واپس ہو گیا۔ جسکی وجہ سے صرف جمشید تنہا رہ گیا۔ اسد خاں بلکوانی (لاری) کے مقابلہ میں جمشید کی ناک اور ایک طرف کا رخسارہ گوشہ لب تک ایسا بطور زخمی ہوا کہ تا دم مرگ کھانے پینے میں تکلیف رہی اور اسی زخم نے سرطانی شکل اختیار کی۔ اس زمانے میں نجوم و رمل کا بڑا زور تھا۔ رمالوں کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ سات برس کی حکومت کے بعد ۹۵۷ھ میں مرگیا۔ چند دن اسکے دو بچے تخت نشین کئے گئے۔ کام بگڑنے لگا۔ بالآخر جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو بھائی کے خوف سے راجہ بیجانگر کے

کے پاس پناہ گزیں تھا، حسب الطلب امرا، واپس آیا اور بجا طور پر تخت کا مالک ہوا۔

ابراہیم | ابراہیم کا نام چار سو سال کے ممتد عرصہ کے بعد اب بھی اپنے رفاہ عام کے کاموں کے لحاظ سے وردِ زبان ہے۔ اس کے بیسوں آثار باقیہ اس کا ذکر خیر تازہ رکھتے ہیں۔ درحقیقت وہ نامور باپ کا نامور بیٹا تھا۔ وہ ایک علم پرور، مدبر، آئین پسند بادشاہ گزرا ہے۔ ارباب کمال، علما، شعرا ہر وقت اس کے ساتھ جلیس تھے۔ تاریخ سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ اُسکے مزاج میں سخت گیری بھی کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ سخت گیری ضابطہ کے لحاظ سے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سخت سزائیں دیا کرتا تھا۔ چنانچہ مجرم کے ناخن جدا کر کے ایک برتن میں رکھکر اس کے روبرو پیش کئے جاتے۔ زمانہ حال میں یہ وحشیانہ سزائیں ہیں۔ لیکن اس سخت گیری کا ہی ثمرہ تھا کہ بقول فرشتہ تلنگانہ جو چوروں اور ڈاکوؤں سے بھرا ہوا جنگل تھا اس کے زمانہ میں پُر امن بن گیا۔ تاجر بخوف و خطر تنہا سفر کرتے۔ لایق عہدہ دار اسکو بھی ہاتھ آئے، جن کی بدولت خاندانِ قطب شاہیہ کا نام روشن ہو گیا۔ مصطفیٰ خاں اردستانی نے اولاً ابراہیم ہی کے دربار میں نام حاصل کیا تھا۔ اسکی پالیسی بھی نظام شاہیہ کے ساتھ اتحاد اور بیجاپور کے ساتھ مخالفت میں رہی۔ لیکن حسین نظام شاہ کا اقتدار بڑھ جانے کے خدشے سے عین وقت پر اسکی رفاقت ترک کر دی۔ بالآخر سب ایک دفعہ متحد ہوئے۔ لیکن رام راج کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس اسکیم کا بڑا کارکن اردستانی بادشاہ کے خوف سے بیجاپور چل کھڑا ہوا۔ راج بندری اسکے زمانہ میں فتح ہوا۔ ابراہیم کے رفاہِ عام کے کام ہم دوسرے حصے میں لکھیں گے۔ اس نے سررشتہ جاسوسی یا خفیہ بھی وسعت کے ساتھ قایم کیا تھا۔ اور غالباً اسی سررشتہ کی بدولت ترکوں کے سلیمان قانونی اور روس کے پیٹر کی طرح اسکے نام کے ساتھ بھی "فرزند کش" کا دلدوز لقب لگا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹا اولوالعزم اور خود صاحب تخت بنا چاہتا تھا۔ لہذا باپ نے اُس کو اولاً قید کیا اور پھر زہر دے کر مروا ڈالا۔ اوہ! اس دلفریب

دنیا کا بر قع کس قدر آلام و محن کی ڈراؤنی صورت اپنے اندر رکھتا ہے!

۵۱ سال کی عمر میں ۳۲ سال کی حکومت کے بعد ۹۸۸ھ میں انتقال ہوا۔

محمد قلی قطب شاہ | ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا بیٹا محمد قلی ۱۲ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا۔ اگرچہ ذاتی اوصاف میں یہ باپ اور دادا سے کم تھا۔ لیکن اسکی نیک نفسی اگر دادا سے نہیں تو باپ سے ضرور بڑھی ہوئی تھی۔ سوسائٹی کے عام رواج کے برخلاف، جسکی بڑی مثالوں سے تاریخ اسلام کو شرم آتی ہے، اس نے بھائیوں سے اچھا سلوک کیا۔ مدت سلطنت میں خود کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا بلکہ دار القضاء کے احکام نافذ تھے۔ داد محل مشہور ہے۔ میر مومن استرآبادی، جن کا دائرہ حیدرآباد میں مشہور ہے، ۲۵ سال اس کے مدار المہام رہے تھے، وہ ایک عالم اور مدبر دونوں اوصاف کے جامع تھے۔ مہمات سلطنت کا دارومدار میر مومن پر تھا۔ اور اس لایق مدار المہام کی وجہ سے بادشاہ کی کمزوری نہ صرف چھپی ہوئی رہ گئی، بلکہ اس کا نام یادگار زمانہ رہ گیا۔ شاہ ایران نے محمد قلی کی لڑکی سے شادی کی اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو صرف اسی خاندان کو حاصل ہوا۔ جس زمانے میں احمد نگر بالکلیہ مغلیہ امپائر کی زد میں تھا اور بیجاپور کو گولکنڈہ سے پرخاش نہ رہی تو گولکنڈہ بعد مسافت اور موافق حالات کی وجہ سے بفکر بفراغ خاطر تمدنی ترقی میں تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ پیارا حیدرآباد اسی عہد کی یادگار ہے۔ اور چارمینار کی نادرۂ روزگار عمارت اس اعلیٰ تمدن کی گواہ عادل ہے۔ سررشتہ تعمیرات و رفاہ عام نے جو ممتاز درجہ اس وقت حاصل کیا تھا اس کی تفصیل دوسرے حصہ میں ہوگی۔ ۴۹ سال کی عمر میں ۳۱ سال کی حکومت کے بعد ۱۰۲۰ھ میں انتقال ہوا۔

محمد قطب شاہ | محمد قلی لاولد تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کی پرورش کی تھی۔ جو اس کا داماد بھی تھا۔ میر مومن مدار المہام نے اس کو تخت پر بٹھایا جبکہ وہ عمر کے اکیس سال طے کر چکا تھا۔

اس بھری جوانی میں اس کے علم اور اسکی سلامت طبع سے زیادہ حیرت انگیز اسکی پرہیزگاری اور پاکیزہ زندگی ہے۔ یہ واقعہ مشہور ہے کہ مکہ مسجد کی بناء کے وقت اس نے کہا تھا کہ بانی ایسا ہو کہ جس کی نماز تہجد قضا نہ ہوئی ہو۔ اور پھر اسی نے سنگِ بنیاد رکھا۔ شاہی گھرانوں میں ناز و تنعم کے بستر پر ایسی نفس کشی کسقدر اعجوبہ ہے! محمد قطب شاہ کا زمانہ قطب شاہی دور ترقی کے عروج کا زمانہ ہے۔ مکہ مسجد کی عالی شان عمارت اس تمدنی علو منزلت کو ہر وقت تازہ رکھے گی۔

میر مومن کے یہ اشعار در حقیقت واقعہ طرازی ہیں:۔

یادگارِ جد و عم سُلطان محمد قطب شاہ — آنکہ ہندستاں ز فیضش گشتہ ایراں نوے

وہ چہ ایراں آں چناں ایراں کہ آید در نظر — رو بہر جانب کہ آری باغِ رضوان نوے

گر صفاہاں نو شد از شاہِ جہاں عباس شاہ — حیدر آباد از تو شد شاہا صفاہان نوے

میر مومن کے بعد مدار المہامی کا عہدہ کسی کو نہیں دیا گیا، بلکہ خود سلطنت کا کاروبار انجام دیتا تھا۔ ایسا نیک نفس نوجوان جوانی ہی میں جبکہ اسکی عمر کے ۳۴ سال ختم ہوئے تھے، سنہ ۱۰۳۵ھ میں اصلی نشیمن ارواح میں واپس چلا گیا۔

اس کی انیس خلوت محترم و مخیر بیوی بھی اپنے نیک نفس شوہر کے ساتھ حیاتِ دوام رکھتی ہے۔ حیات النساء بیگم کے رفاہ عام کے بیسوں کام ہمیشہ اس کا نام زندہ رکھیں گے۔ مسجدیں، مدرسے، لنگر خانے کیا کیا اس نیک دل خاتون نے نہیں کیا۔ لنگرِ محرم کا سلسلہ اسی کی بدولت چلا آرہا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ | ایسے نیک جوڑے کو یہ اکلوتا لاڈلا بیٹا خدا نے عطا کیا جس کی گھٹی میں نیکی اور علم کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا۔ لیکن انتظامی قابلیت کم ہو جاتی ہے۔ اب عروج کا زمانہ ختم اور متواتر قیام امن کی وجہ سے ترفہ اور اس کے بعد آثار ضعف پیدا ہو چلے تھے۔

عہدے بجائے اصلی قابلیت کے اعزاز پر دئے جانے لگے تھے' اور اس سے نظامِ سلطنت میں خلل پیدا ہو چلا تھا۔ کُل دکن میں اُس وقت صرف حیدر آباد ہی دارالعلم تھا۔ جابجا مدرسے قایم تھے۔ مشہور فارسی لغت "برہان قاطع" اُسی کے نام پر معنون ہوئی ہے۔ مغلیہ رَو نے گولکنڈہ کو بھی اپنے زیر حمایت لے لیا۔ خطبہ بطریق اہلِ سنّت بنام شاہجہاں جاری ہو چکا تھا۔ باوجود اندرونی کمزوری کے اُس کا زمانہ فوج کشی اور توسیع قلمرو کے لحاظ سے اس طرح ممتاز ہے جس طرح بیجاپور میں محمد عادل کا زمانہ۔ اصل یہ ہے کہ شمالی اور وسط ہند میں زبردست مغلیہ امپائر قایم ہو چکی تھی۔ نظام شاہی خلش باقی نہ رہی تھی۔ اب بقیۃ السیف دونوں ریاستوں عادل شاہی اور قطب شاہی کو کرناٹک کی طرف پیشقدمی کا بے کھٹکے موقع مل گیا۔ چنانچہ تاریخ ہند کے مشہور رُکن میر محمد سعید اردستانی میر جملہ کی توجہ سے کرناٹک کا معتدبہ حصہ داخل قلمرو قطب شاہی ہوا۔ یہی میر جملہ جو قطب شاہی ریاست کا نامور رکن تھا اور جس کے کارہائے رفاہِ عام کا یادگار مشہور تالاب اب صدیوں کے بعد معدوم ہونے کو ہے' بیٹے کی نالائقی کی وجہ سے دربار گولکنڈہ سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے اور اس نے اورنگ زیبؒ سے جو اُس وقت دکن کے وایسرائے تھے توسل ڈھونڈھا۔

۱۰۶۶ھ میں شہزادہ محمد بن عالمگیرؒ نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا' جو اس اسلامی شہر پر پہلا حملہ تھا۔ شہر کی حالت اس وقت صرف ایک تجارتی منڈی (مارکٹ) اور سیرگاہ کے طور پر تھی۔ کوئی فصیل اور اسبابِ مدافعت مطلق نہ تھے۔ بہر حال حیدر آباد عام سنتِ فاتحین کے مطابق خوب لٹا۔ سلطان عبداللہ نے صلح کر لی۔ اسکی بیٹی شہزادۂ محمد سے بیاہی گئی۔

۱۰۸۳ھ میں (۶۰) سال کی عمر میں ۴۸ سال کی گرم و سرد زمانہ اطوارِ سلطنت دیکھنے کے بعد اس کا لاولدی کی حالت میں اِنتقال ہوا۔

ابوالحسن تاناشاہ | سلطان عبداللہ کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ تین لڑکیاں تھیں۔ ایک تو خود عالمگیرؒ کے بیٹے سے بیاہی گئی تھی۔ دوسری سید احمد سے، تیسری ابوالحسن سے۔ ابوالحسن کو یہ دامادی محض خوبی قسمت سے نصیب ہوگئی تھی۔ جس کا قصہ دکن میں ایک دلچسپ کہانی[۱] ہے۔ سید احمد کی پارٹی کمزور تھی۔ ابوالحسن کی پارٹی زوردار تھی۔ اس لحاظ سے اس کو تخت گولکنڈہ بھی دوسری خوش قسمتی سے نصیب ہوگیا۔ بہرصورت قطب الملک کا خاندان گویا ختم اور ریاست دوسرے خاندان میں منتقل ہو چکی تھی۔

سید مظفر مدار المہام چاہتا تھا کہ ابوالحسن اسکے ہاتھ میں کٹ پتلی بنا رہے۔ ابوالحسن اوس سے نجات ڈھونڈھ رہا تھا۔ مادنّا پنڈت نے جو مستقل پیشکار اور سید مظفر کا اصلی کارپرداز اور اس لحاظ سے دراصل وہی مدار المہامی کر رہا تھا، ابوالحسن سے سازش کرلی۔ چنانچہ بتدریج سید مظفر کے آوردوں کو بے پروبال کرکے قلمدانِ وزارت اس سے لے لیا گیا۔ سید مظفر بھی مع اپنے بیٹے کے عالمگیرؒ کا متوسل جا بنا۔ علیٰ ہذا القیاس مشہور سپہ سالار خلیل اللہ پلنگ، جو حمایت خاں کے خطاب سے پنجاب کا صوبہ دار بنا۔ اب مادنّا مدار المہام ہوگیا اور اس کا بھائی ینکنا پیشکار۔ مادنا اصل میں کرناٹک کے برہمنوں سے تھا۔ اُس نے اور ہی رنگ جمانا شروع کیا۔ غیر مسلم قوت کو ترقی دی جانے لگی۔ ابوالحسن لاابالی مزاج تھا۔ انتظام ریاست سے اُس کو ذاتی دلچسپی مطلق نہ تھی۔ مادنّا کا اقتدار اس حد تک بڑھا کہ اُس نے بیرون شہر ایک بت خانہ بنایا اور اُس کے تہوار کے روز خود مع اپنے بھائی کے سواری میں سادات و شرفا کو جلوس میں رکھتا۔ یہاں

---

[۱] سید سلطان جس سے شادی قرار پائی تھی، گولکنڈہ سے چلا گیا اور عالمگیرؒ کے پاس ملازم ہوگیا۔ علیٰ ہذا القیاس سید احمد کا بیٹا سید علی جو اسکی پہلی بیوی سے تھا، وہ بھی عالمگیرؒ کے پاس گیا، اگرچہ پھر وہاں سے وہ شیراز چلا گیا اور معتکفِ علم ہوا۔ یہ ایک نامور عالم گزرا ہے۔ اسکی تصانیف مشہور ہیں۔ ایک سفرنامہ عربی میں ہے۔

تک بھی کہا گیا ہے کہ وہ یوں خطاب کرتا "تمھارے دادا نے بت توڑے تھے اور میں تم کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں"۔

سیواجی نے بھی حیدر آباد پر حملہ کر کے ۱۰۸۰ھ میں ابوالحسن سے خاطر خواہ عہد نامہ لکھوا لیا خود بیجا پور والوں نے بھی اپنی افتادہ حالت میں گولکنڈہ کا رُخ کیا' گونا کام رہے۔ آخر عالمگیرؒ سے ٹکر کا وقت آگیا جسکی چھیڑ خود ابوالحسن نے کی تھی کہ بیجا پور کی تائید میں سخت لکھ بھیجا۔

۱۰۹۷ھ میں شہزادہ معظم نے حیدر آباد پر قبضہ کر لیا۔ پانچ چھ کروڑ کی دولت کا لٹنا بیان کیا جاتا ہے۔ شرائط صلح کی گفتگو ہو رہی تھی۔ جس میں اہم شرط یہ تھی کہ مادنا اور بنکنا معزول ہوں' کہ اس اثنا میں دونوں بھائی خود انکے ذاتی طور سے گزند پائے پائے اشخاص کے ہاتھوں بتخانہ کے پاس مار ڈالے گئے اس طرح صلح ہو گئی۔ لیکن چونکہ عالمگیرؒ کو پورا قبضہ مقصود تھا۔ لہذا اِس صلح پر شہزادہ معظم پر عتاب ہوا۔ ابوالحسن کو سنبھاجی سے تعلقات تھے۔ بالآخر عالمگیرؒ کے مشہور محاصرہ کا زمانہ آگیا۔ بیجا پور کی فتح کے بعد عالمگیرؒ نے بذاتِ خود گولکنڈہ کا رُخ کیا۔ آٹھ مہینے محاصرہ رہا اور اگر جس طرح دنیا کے اور مشہور محاصروں میں ہوتا آیا ہے امراء دربارِ گولکنڈہ عالمگیر سے نہ مل گئے ہوتے تو اور بھی اِمتداد ہوتا۔

اس محاصرہ کے زمانہ میں ایک مقدس عربی النسل شیخ طریقت مگر مدت سے تورانی الوطن بہادر بوڑھا قلعہ کے قریب ہلّہ کر کے پہنچ جاتا ہے۔ مگر عین اُسی وقت اُس کا ہاتھ گولی سے اڑ جاتا ہے۔ اور گو وہ اس وقت بھی انتہا کی ثابت قدمی دکھاتا ہے' اور اسی طرح آپریشن[1] کے وقت' لیکن آخر کار اُس صدمہ سے وہ اِس ظلمت کدہ سے عالمِ جاودانی میں اُٹھ جاتا ہے۔ وہیں گولکنڈہ کے قریب میدانِ جنگ میں دفن ہوتا ہے۔ اور گویا اپنے نورِ باطن سے اپنی نسل کو خبردار کر رہا

---

[1] یوروپین سرجن اس سے بہت پیشتر یورپ کا نام ہند میں زندہ کر چکے تھے۔ جیسا کہ بیجا پور کے حالات میں بیان ہو چکا ہے۔

ہے کہ میرے اس دفن سے تم کو اس قلعہ بالا حصار کا تخت نصیب ہوگا۔

ابناء وطن! یہ بزرگ شیخ الطریقت قاضی صدر الصدور حاجی قلیچ خاں بہادر غازی الدین خان فیروز جنگ فاتح بیجاپور کے باپ اور آصف جاہ اول نور اللہ مرقدہٗ کے دادا اور شاہان آصفیہ کے مورث اعلیٰ تھے۔

رب انصر السلطان میر عثمان علیخاں و وفقہ بما تحبہ و ترضیٰ بہ۔

کتاب کا یہ حصہ اس نوبت پر ختم ہوتا ہے۔ اگر توفیق ربانی یاور ہوئی تو "نظام آصفی" کا نظارہ جو اس مقدمہ کا مقصود ہے جلد پیش کیا جائیگا۔ والسلام



کتب

ریاضُ النِّسواں فقہ شافعی مولفہ حضرت امام العلماء مولانا قاضی الملک بدر الدولہ مرحوم و مغفور مستند کتاب جس میں نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل صراحت سے لکھے گئے ہیں۔ کاغذ چکنا رائل۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت ۱۲/عصر

تحفۃُ الخلان فقہ شافعی۔ جس میں بیع وغیرہ معاملات اور فرائض و جنایات وغیرہ کے مسائل معتبر کتب سے منتخب کرکے جدید طور سے لکھے گئے ہیں۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ قیمت ۱۲/عصر

لمعاتِ آصفیہ۔ قیمت عصر

ملنے کے پتے

(۱) حبیب شرکاء اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن
(۲) شمس المطابع عثمان گنج۔ حیدرآباد دکن
(۳) مدرسہ محمدی رانی پیٹھ مدراس